لہٗ دعوۃ الحق
قرآن و سنت کی تعلیمات کا علمبردار

فون نمبر - دار العلوم - ۴ | فون نمبر ڈھاکہ بازار - ۲

ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک

جلد نمبر : ۸
شمارہ نمبر : ۵

فروری - ۱۹۷۳ء
محرم الحرام - ۱۳۹۳ھ

مدیر
سمیع الحق

اس شمارے میں

ناشر : سمیع الحق استاد دار العلوم حقانیہ ---- مقام اشاعت : دفتر الحق دار العلوم حقانیہ اکوڑہ
طابع : منظور عام پریس پشاور ---- پرنٹر : محمد شریف ---- کتابت : اصغر حسین

مغربی و مشرقی پاکستان سے سالانہ ۸/ روپے | فی پرچہ ۷۵ پیسے | غیر ممالک بحری ڈاک ایک پونڈ ہوائی ڈاک دو پونڈ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقش آغاز

عالم اسلام کی سب سے قدیم اور عظیم اسلامی یونیورسٹی جامع ازہر کے ریکٹر شیخ محمد محمد الفحام نے دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں اپنی تشریف آوری کے موقعہ پر جو خطاب فرمایا اس میں انہوں نے زیادہ تر زور عربی زبان کی اہمیت محسوس کرنے پر دیا اور فرمایا کہ مختلف زبان رکھنے والے مسلمانوں کے باہمی اتحاد اور اخوت قائم رکھنے کیلئے عربی کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ شیخ نے یہ بھی فرمایا کہ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ مسلمان اپنی علاقائی زبانیں چھوڑ دیں۔ خدا نے ہر ملک اور ہر قوم کے لئے الگ الگ زبانیں بنائی ہیں۔ اور اس کی حکمتیں اور شان قدرت کا ظہور اس اختلاف کا متقاضی ہے، لیکن جب ایک طرف ہم پشتو اردو فارسی سیکھتے ہیں تو بحیثیت مسلمان ہمیں عربی زبان کا سیکھنا بھی اس لئے ضروری ہے کہ عربی صرف عربوں کی زبان نہیں بلکہ یہ لغۃ الاسلام ہے، قرآن کی زبان ہے اور ہمارے مقتدائے دین و دنیا سرور کائنات علیہ السلام کی زبان ہے اور جو اپنے اندر ان کی تعلیمات کو سموئے ہوئے ہے، اس لئے اس معاملہ کو تعصب سے نہیں بلکہ اس زاویہ سے دیکھنا چاہیئے، انہوں نے اس سلسلہ میں ایک روایت بھی بیان کی کہ جو اللہ کو چاہے گا، تو لازماً حضورؐ کو بھی، اور جسے نبیؐ عربی سے محبت ہوگی اسے عربوں سے بھی، اور جب عربوں سے ہوگی تو وہ عربی زبان سے بھی محبت رکھے گا ـــــ مگر اس منطقی اور طبعی محبت کا تقاضا ہے کہ مسلمان اپنے ہاں عربی زبان کی تعلیم و تعلّم اور افہام و تفہیم کو اہمیّت دیں۔ اس کی ترویج میں بھرپور حصّہ لیں انہوں نے بالکل صحیح کہا کہ ایک مسلمان بآسانی گوارا نہیں کرسکتا کہ کسی اسلامی مملکت میں جاکر وہ مسلمانوں کی زبان عربی کے سمجھنے اور سمجھانے والے نہ پائیں، مسلمانوں کے لئے یہ چیز شرم کی بات ہونی چاہیئے۔

عربی کی ترویج کے لئے مدارس عربیہ کی کوششوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے جمعیۃ العلماء اسلام کے اس موقف کو بھی سراہا کہ مسلمانوں کے باہمی اتحاد اور روابط کیلئے عربی یہاں کی سرکاری زبان ہونی چاہیئے۔ شیخ الازھر نے دار العلوم حقانیہ اور دیگر مدارس میں عربی زبان کی تعلیم و تعلّم کے سلسلہ میں بجا طور پر خواہش ظاہر کی کہ اس سلسلہ میں جدید عربی نصاب اور جدید ترین کتابوں سے استفادہ ضروری ہے۔ جب کہ ہر زبان کیطرح عربی ادب میں انداز تحریر، طرز بیان اور نئے نئے الفاظ و اصطلاحات کی وجہ سے کافی تبدیلی آچکی ہے۔

جب کہ ہمارے مدارس میں عربی کو بحیثیت عربی زبان کی تعلیم و ترویج پر کما حقہ، توجہ نہیں دی جا رہی اور یہ ایک بڑی کمی ہے جو ہمارے ہاں کے علماء اور طلباء اپنے اندر محسوس کرتے ہیں۔

اس تقریب کے افتتاح میں قائد جمعیۃ مولانا مفتی محمود صاحب نے بھی عربی کی اہمیت پر مؤثر انداز میں روشنی ڈالی اور اسے پاکستان کے لسانی مسائل کا واحد حل قرار دیا، انہوں نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ ہم اپنی آئینی جدوجہد میں اس لئے عربی کو سرکاری زبان قرار دینے پر زور دیتے ہیں کہ ہماری داخلی اور خارجی ضروریات ہمیں مجبور کر رہی ہیں۔ پاکستان مختلف صوبوں اور علاقوں کا مجموعہ ہے۔ اور ہر حصے کی الگ الگ زبان ہے۔ اب اگر ہمیں کسی ایک زبان کے ذریعہ ان حصوں کو مربوط رکھنا ہے تو سوائے عربی کے کوئی بھی جامع زبان ہمیں نہیں مل سکتی، اپنے ازلی دشمن انگریز کی انگریزی سے نجات پانے کی یہی ایک صورت ہے خارجی ضرورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا مفتی محمود نے فرمایا کہ چونکہ عربی ہمارے قرآن و رسول ہمارے مذہب اور ہمارے کروڑوں عرب بھائیوں کی زبان ہے اس لئے یہ عالم اسلام کے باہمی ربط و اتصال کیلئے ایک لازمی کڑی ہونی چاہئے ۔۔۔

★
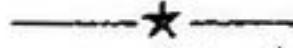
اس میں شک نہیں کہ ہمارے ہاں عربی کو اس کا صحیح مقام دینے کی راہ میں کافی مشکلات ہیں، اساتذہ کا مسئلہ ہے، نئی کتابوں کی فراہمی ہے، عربی کو لسانیاتی حیثیت سے نظام تعلیم اور نصاب تعلیم میں وہ جگہ دینی ہے جو ترقی یافتہ مروجہ عربی ادب کو عرب ممالک میں حاصل ہے۔ مگر ایک اسلامی مملکت جب علاقائی زبانوں کیلئے سب کچھ کر سکتی ہے تو کیا وجہ ہے کہ ملکی و ملی بقاء استحکام کی حامل اس ضرورت پر توجہ نہ دی جائے چونکہ اس کا تعلق پورے ملک سے یکساں رہے گا، اس لئے مرکزی حکومت بالخصوص اس کے امور دینیہ حج و اوقاف وغیرہ کے سربراہ مولانا کوثر نیازی پر بھی اہم ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی میں عربی کی اس ضرورت کا پورا لحاظ رکھا جا سکتا ہے۔ جدید عربی نظام تعلیم اور مروجہ نصابوں پر عبور، عالم عرب کے تعلیمی اور ادبی اداروں علمی شخصیات سے تبادلہ خیال اور استفادہ کے لئے عربی سے ذوق رکھنے والے علماء اور طلباء کے وفود کا عرب ممالک سے تبادلہ ہو سکتا ہے۔ عرب ممالک سے اس سلسلہ میں تعاون اور مدد حاصل کی جا سکتی ہے جس کے نتیجہ میں یہاں عربی زبان کی ترویج و تعلیم کے لئے نہایت مفید تجاویز زیر عمل لائی جا سکتی ہیں، صوبائی حکومتیں اپنی اپنی جگہ مفید اسکیم اور منصوبے بنا کر عربی کے لئے رفتہ رفتہ ایسا میدان تیار کر سکتی ہیں کہ وہ آگے چل کر بغیر کسی دقت کے پاکستان کی سرکاری زبان بن سکے یہ سب ملک و ملت سے خیر خواہی کے جذبات عربی سے شغف علمی ذوق اور عالم اسلام کے مشترکہ مسائل کا احساس و شعور رکھنے کے علاوہ خدائے کریم کی توفیق

اور دستگیری پر ہے: دیکھئے پاکستان کی ملتِ اسلامیہ کب ایسی اہم ذمہ داریوں کو نبا ہنے کی اہل بنتی ہے -؟

وزیرِ اوقاف و حج مولانا کوثر نیازی نے جب قومی اسمبلی میں ایک لاکھ سے زائد افراد کو حج پر بھیجنے کا اعلان کیا تو بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ شاید وزیر موصوف یہ وعدہ پورا نہ کرسکیں، ملکی حالات، طرح طرح کے بحران، سانحہ بنگال اور وسائل و ذرائع کی قلت یہ سب باتیں ایسی رائے قائم کرنے کے باعث بنیں۔ حاجیوں کے بھیجنے میں ان امور کیوجہ سے کئی دقتیں آئیں اور دشوار گزار مراحل سے گزرنا پڑا۔ لوگ امید وبیم کی کلفتوں سے دوچار ہوئے، مگر اب جب کہ موسم حج بخیر وخوبی گذر گیا ہے اور خداوند تعالیٰ نے ان سب مشکلات کے ہوتے ہوئے حکومت کو اس اہم کارنامہ انجام دینے کی توفیق دیدی ہے کہ برِصغیر کی تاریخ میں پہلی مرتبہ تقریباً ایک لاکھ پاکستانی سعادتِ حج وزیارت سے مشرف ہوچکے ہیں اور عالمی برادری میں تعداد کے لحاظ سے پاکستان نے ایک ریکارڈ قائم کردیا ہے۔ تو حق ناشناسی ہوگی اگر ہم اس مہم کو بڑی حد تک سرکر لینے پر مرکزی حکومت بالخصوص مرکزی وزیرِ اطلاعات و حج و اوقاف کو مبارکباد نہ دیں۔ ہمیں حج سے پہلے اور اب حج کے بعد حاجیوں کی مشکلات کا بھی علم ہے اور اتنی بڑی تعداد کیوجہ سے کچھ بدنظمیاں بھی ہوسکتی ہیں بعض افراد جو مستحق تھے نہ جاسکے اور کچھ شرائط پر پورے نہ ہوتے ہوئے پہنچ گئے۔ مگر اتنی عظیم تعداد کے بھیجنے کا نیا نیا تجربہ نازک حالات کے ساتھ اس امر میں ہر شخص کے مقدرات اور خدا کی حکمتوں کا بھی دخل ہے۔ سفرِ حج جو سراسر سفرِ عشق ہے اس راہ میں اضطراب اور صعوبتوں کی گھاٹیوں سے گذرنا پڑتا ہے، جو شیوۂ عشاق ہے۔ یہ سفر کھری اور کھوٹی محبت پر کھنے کی ایک بھٹی ہوتی ہے اور خوش بخت کندن بن کر نکل جاتے ہیں۔

—— اس سال سفرِ حج کے لئے خشکی راستہ کا بھی ایک نیا تجربہ کیا گیا ہے، اس کی تفصیلات قافلوں کی واپسی پر معلوم ہوں گی تاہم اگر یہ تجربہ کامیاب رہے اور اس راہ کی دشواریاں اور خامیاں دور کردی گئیں تو عالم اسلام سے پاکستانی مسلمانوں کے روابط باہمی مسائل سے آگاہی ایک دوسرے کے معاشرتی اور سماجی و اقتصادی حالات کے تغیر و تبدّل سے باخبر ہونے کیلئے یہ سلسلہ نہایت اہم ثابت ہوسکے گا۔ اور مسلمان ارشادِ خداوندی سیروا فی الارض۔ کی حکمتوں سے فائدہ اٹھاسکیں گے۔ اور آئندہ جب تک یہ سلسلہ قائم رہے گا۔ موجودہ حکومت بالخصوص وزیرِ حج کے لئے ایک ذریعہ ذکرِ خیر اور بہترین صدقۂ جاریہ ثابت ہوگا —— ہمیں اس سلسلہ میں وزیرِ حج مولانا نیازی کی اس کامیابی پر ان کے بحیثیت عالمِ دین ہونے کے مزید خوشی ہے، اور گویا یہ اس امر کا ایک اور ثبوت ہے کہ علماءِ دین زندگی کی ہر قسم کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی اہلیت، اوروں کی بہ نسبت زیادہ

رکھتے ہیں اور گرانبار پیچیدہ مسائل حل کرنے کی صلاحیت ان میں اوروں سے کم نہیں ہوتی۔

یہاں برسبیل تذکرہ ایک ذاتی مسئلہ کا ذکر مناسب ہے کہ برّی راستہ کے امراءِ قافلہ کی ضمن میں جب میرا نام بھی اخبارات میں آیا تو بہت سے احباب نے مبارکباد کے خطوط لکھے اور بہت سے اب اس سفر کے مشاہدات و تاثرات قلمبند کرنے کا تقاضا کر رہے ہیں تو ان کی آگاہی کے لئے عرض ہے کہ کچھ تو اپنے اندر قافلہ کی امارت کی گرانبار ذمہ داریاں سنبھالنے کی اہلیت نہیں پاتا تھا۔ اور کچھ مشاغل اور عوارض سدِّ راہ بنے کہ میں اس سہولت سے فائدہ نہ اٹھا سکا اور حج پر نہ جا سکا، ورنہ قارئین کی تعمیلِ حکم اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

———— ★ ————

ہم نے پچھلے اداریہ میں چند ایسی ضروری باتوں کی نشاندہی کی تھی جن کا لحاظ کسی اسلامی مملکت کے دستور میں ہر طرح ضروری ہے۔ اب جبکہ دستور کا مسودہ بل کی صورت میں سامنے آگیا ہے اور ۱۷ر فروری سے اسمبلی میں اس پر مفصّل بحث و تمحیص ہونے والی ہے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس مسوّدہ کی "اسلامی حیثیت" پر مفتی محمودؔ صاحب کی اس تقریر کا کچھ حصّہ پیش کر دیں جو ریڈیو اور ٹی وی پر نشر ہوئی، کیونکہ مسوّدہ کی اسلامی حیثیت پر حضرت مفتی صاحب کی اس تنقید سے ہمیں کلاًّ اتفاق ہے؛

سمجھوتہ کی اسلامی دفعات کی دفعہ اکتالیس میں یہ بات واضح طور پر تسلیم کی گئی ہے کہ کوئی قانون بھی قرآن اور سنت میں مذکورہ احکامات کے خلاف نہیں بنایا جائے گا۔ موجودہ قانون کو ان احکامات کے مطابق ڈھالا جائے گا۔ دفعہ بیالیس میں ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل اس طرح تشکیل دی جائے گی کہ اسلام کے احکامات پر مثبت عمل درآمد کے لئے راہ ہموار کرے، لیکن مسودہ دستور میں بنیادی حقوق کی ضمنی دفعہ انیس ۱۹ میں ہر شہری کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ کوئی بھی مذہب اختیار کر سکتا ہے۔ اس طرح مذہبی آزادی کے خوشنما عنوان سے مسلمانوں کو مرتد ہونے کا بنیادی حق دیا گیا جو صریحاً اسلامی اصول سے انحراف ہے۔ دوسرا یہ ہوا کہ اسلامی کونسل کو غیر مؤثر بنا کر سمجھوتہ کی روح کو کچل دیا گیا ہے، جبکہ مسوّدہ آئین میں طے کر لیا گیا ہے کہ جب تک پارلیمنٹ کا کوئی ایوان یا صوبائی اسمبلی کی اکثریت کی رائے سے کوئی قرارداد منظور نہ کر لی جائے۔ اسلامی کونسل کی طرف رجوع نہیں کیا جائے گا۔ ہماری رائے میں متعلقہ قانون ساز ادارے کے ہر رکن کو یا کم از کم اسمبلی کے مقرّر کردہ کورم کی تعداد کے برابر ممبرز کو بھی حق ملنا چاہئے کہ وہ کسی بھی مجوزہ قانون کو اگر محسوس کریں کہ یہ غیر اسلامی ہے تو اسلامی کونسل کے پاس بھیج سکیں۔

موجودہ مسودہ دستور میں تجویز کردہ طریق کار درحقیقت اسلامی کونسل کے مشوروں سے انحراف

کے مترادف ہے۔ نیز اگر ایک سوال اسلامی کونسل کو بھیج دیا جاتا ہے تو اس وقت تک اس سوال سے متعلق قانون سازی ملتوی ہونی چاہئے، جب تک کہ متعلقہ مقننہ کو مشورہ فراہم نہیں کیا جاتا، لیکن مجوزہ دستور میں مقننہ کو اس بات کا پابند نہ کرنا درحقیقت اسلامی کونسل کی حیثیت کو بے اثر بنانے کی ایک کوشش ہے۔ اس طرح اسلامی کونسل کا مشورہ حاصل ہونے کے بعد مقننہ کو اس مشورہ کا پابند ہرگز نہیں بنایا گیا بلکہ مقننہ اس مشورہ کو بلا روک ٹوک آزادی سے مسترد کر سکتی ہے۔

اب آپ خود فیصلہ کریں کہ کیا اس طریقۂ کار سے اس ملک میں اسلامی قانون سازی کی ضمانت دستور مہیا کر سکتا ہے۔؟ اور کیا یہ سمجھوتہ میں اسلامی قانون سازی حق کو تسلیم کرنے والی شق کی صریحاً خلاف ورزی نہیں ہے۔؟ نمبر تین یہ کہ کتاب وسنت کی قانون سازی کو دوسرے بنیادی حقوق کا مقام مسودہ میں نہیں دیا گیا۔ کسی بھی غیر اسلامی قانون کو عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ اگر تمام بنیادی حقوق کو عدلیہ کے پاس چیلنج کیا جا سکتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ اسلامی اصول کے منافی قانون کو جو صرف فرد واحد بلکہ ملک کے کروڑوں مسلمانوں کی حق تلفی ہے، کو عدالت میں چیلنج کرنے سے روک دیا گیا۔ مزید برآں یہ کہ رسوائے زمانہ مسلم فیملی لاز کو جو تمام اسلامی مکاتب فکر کے نزدیک غیر اسلامی ہیں کو دستوری تحفظ دیا گیا۔ کیا یہ بھی خلاف ورزی نہیں ہے۔؟

اس پر مستزاد یہ کہ ججز حتیٰ کہ پاکستان کے چیف جسٹس کو بھی مسلمان ہونے کی شرط سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ جبکہ ہم نے آئینی کمیٹی میں ججوں کے لئے مسلمان کی شرط کی ترمیم پیش کی تھی جس پر ہمارا اختلافی نوٹ بھی موجود ہے تو کیا اسلامی قانون کی قوت نافذہ کو غیر مسلم کے ہاتھ میں دینے کی صورت میں اسلامی قوانین کے تحفظ کی ضمانت مل سکتی ہے؟ اس کے علاوہ سمجھوتے میں اسلامی دفعات کی دفعہ چار میں اسلام کو پاکستان کا سرکاری مذہب قرار دیا گیا ہے، تو اب اس کے کچھ تقاضے ہیں۔ گویا اس کے معنی یہ ہیں کہ پاکستان کو ایک نظریاتی مملکت قرار دے دیا گیا۔ اور ایک نظریاتی مملکت میں سب سے اہم بات یہ ہوتی ہے کہ اس ملک کی کلیدی اسامیوں پر ایسے لوگ تعینات نہیں کئے جا سکتے جو سرے سے اس نظریئے پر ایمان بھی نہیں رکھتے۔

آپ کسی کمیونسٹ ملک میں ایسی مثال نہیں دے سکتے کہ اس میں کسی بھی اہم کلیدی اسامی پر کمیونزم پر یقین نہ رکھنے والا شخص فائز ہوا ہو۔ اور نہ ہی کیپٹلسٹ ممالک میں ایسی کوئی نظیر ملتی ہے۔ لیکن ہم نے جب آئینی کمیٹی میں اس شق کے تحت تجویز پیش کی کہ تینوں افواج کے سربراہوں کے لئے بھی مسلمان ہونے کی شرط لگائی جائے تو اس سے بھی انکار کر دیا گیا۔ ——— تقریر کے بعد انٹرویو نگار

نے مفتی صاحب سے دریافت کیا کہ اسلامی نظریاتی کونسل کو کیا آپ قوم کے منتخب نمائندوں کے ادارے اسمبلی پر بھی ایسے بالادستی دینے کے حق میں ہیں۔؟ تو مفتی صاحب نے جواب دیا کہ : دیکھئے ، اس میں ، ایک اصولی بات عرض کر دوں ، وہ یہ کہ بنیادی حقوق کی دفعات ۔ اس میں ہر ایک شخص کو بنیادی حق میں ، کورٹ میں ، عدالت میں جانے کا حق دیا گیا ہے ، تو اگر اسمبلی کوئی قانون پاس کر دے جس سے کسی بنیادی حق پر ضرب آتی ہو اور اس کے لئے کوئی شخص کورٹ میں چیلنج کر دے اور کورٹ یا عدالت عالیہ فیصلہ دے دے کہ یہ بنیادی حقوق سے متصادم قانون ہے تو وہ کالعدم ہو جاتا ہے ، اب میں کہتا ہوں کہ کیا آپ ایک جج کو ایک سرکاری ملازم کو تو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ منتخب عوامی اسمبلی کے فیصلے کو کالعدم قرار دیدے ۔ تو ایک اسلامی کونسل جو ہے اس کو بھی یہ حق ملنا چاہیئے کہ وہ فیصلہ دے دے کہ یہ بات اسلام کے خلاف ہے تو وہ قانون کالعدم ہو جائے ۔

انٹرویو نگار : ـــــ میں ایک اور بات کا آپ سے جواب چاہوں گا ، ایک تو یہ ہے کہ صاحب ان قوانین کو اسلامی قوانین کے سلسلے میں عدالتی چارہ جوئی کا حق دیا جائے ۔

مفتی محمود : ـــــ جی ہاں ، جی ہاں ،

انٹرویو نگار : ـــــ آپ نے ابھی اپنی تقریر میں فرمایا ہے کہ اسمبلی کو ۔ قومی اسمبلی کو اسلامی نظریات کی کونسل کے مشوروں کا سفارش کا پابند نہیں بنایا گیا ۔ پابند بناتے ہیں تو پھر دوسری بات ہو جاتی ہے ۔ میں اس کی وضاحت چاہوں گا ۔؟

مفتی محمود : ـــــ تو میں سمجھتا ہوں کہ اگر وہ اسلامی مشورہ آجائے تو پھر اسمبلی کو اس کے خلاف قانون بنانے کا حق نہیں ہونا چاہیئے ۔

انٹرویو نگار : ـــــ نہیں ہونا چاہیئے ؟ تو صاحب ، میں تو یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ جس اسمبلی میں آپ جیسے بزرگ زعما تشریف رکھتے ہوں وہ کوئی اسلامی قوانین ـــــ قرآن و سنت کی تعلیم کے منافی کوئی قانون بنائے ۔؟

مفتی محمود : ـــــ اور میں یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ جہاں مجھ جیسے لوگ اور دوسرے لوگ بیٹھے رہیں وہاں بنیادی حق کے خلاف قانون کیسے پاس ہو سکے گا تو بنیادی حق میں اب کورٹ کا فیصلہ جو ہے قانون کالعدم قرار دیتا ہے اسمبلی کی بالادستی ختم ہو جاتی ہے ۔

انٹرویو نگار : ـــــ یہ تو بہر حال ، مجھے یقین ہے کہ کوئی ایسا قانون پاس نہیں ہو سکتا ۔۔۔ ؟

مفتی محمود : ـــــ تو وہاں کیوں ہے کورٹ کر سکتا ہے جو اصول وہاں ہے وہ اصول اسلام

کے بارے میں بھی ہونا چاہیئے ۔

انٹرویو نگار :۔۔۔۔۔۔ اس لیئے کہ بنیادی حقوق کے سلسلے میں کوئی طریق کار وضع نہیں کیا گیا۔ اس میں اسلامی نظریات کی کونسل جیسا کوئی ادارہ نہیں بنایا گیا اور اس لیئے وہاں عدالت کو یہ حق دیا گیا لیکن جب یہاں اسلامی نظریات کی کونسل موجود ہے جس میں ہائی کورٹ کے جج صاحبان بھی ہونگے، علماء بھی ہونگے، تمام مکاتب فکر کے علماء ہونگے انتظامی اور اقتصادی ماہرین بھی ہوں گے تو اسکے مشورے کے بعد ظاہر ہے کہ ایک ایسی قومی اسمبلی جو مسلمانوں ہی کی اسمبلی ہے اور جس میں علمائے دین بھی موجود ہیں ان کی بھی نمائندگی ہے اس سے توقع نہیں کی جاسکتی کہ صاحب وہ کوئی قانون پھر قرآن وسنت کے منافی بنائیگی ۔۔۔۔؟

مفتی محمود :۔۔۔۔۔ اس سلسلے میں دیکھیئے بات یہ ہے کہ اگر دستور میں کسی بھی قانون کے بارے میں ملک کے ہر شہری کو یہ حق دے دیا جائے کہ اگر وہ سمجھتا ہے کہ یہ غیر اسلامی ہے تو عدالت میں اس کو چیلنج کر سکے۔ اگر یہ حق دے دیا جائے تو پھر میں سمجھتا ہوں کہ اسلامی کونسل کے مشورے کا پابند کرنا ضروری نہیں ہے۔ چونکہ وہ حق وہاں سے وصول کرلیں گے۔ کورٹ سے وصول کرلیں گے۔ لیکن اگر وہ بھی نہیں اور یہ بھی نہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ اس طریقے سے اسلامی قانون کا تحفظ نہیں ہوسکے گا۔

واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل

سمیع الحق

فضلاء دارالعلوم حقانیہ

توجہ فرمائیے

دارالعلوم کے فضلاء کی تعداد بحمداللہ دو ہزار کے قریب ہے اور اکثر فضلاء ملک وبیرون ملک میں اہم دینی وعلمی خدمات انجام دے رہے ہیں اور بعض چاہتے ہیں کہ علمی و دینی خدمات کا موقعہ ملے۔ لہٰذا اوقات ایسی خدمات کیلئے دارالعلوم میں طلب کے خطوط آتے ہیں مگر فضلاء کا رابطہ نہیں ہوتا اس لئے ہم تعمیل سے قاصر رہ جاتے ہیں مزید براں اس وقت دارالعلوم حقانیہ کی پچیس سالہ تاریخ کی ترتیب و تدوین بھی زیر تجویز ہے جس میں تمام فضلاء کے موجودہ پتوں اور خدمات کا تذکرہ بھی زیر غور ہے، اسلئے اولین فرصت میں دفتر تنظیم فضلاء دارالعلوم کو تمام فضلاء حسب ذیل معلومات فراہم کریں ۔ ۱۔ موجودہ پتہ ۔ ۲۔ سابقہ پتہ جو دفتر میں درج تھا۔ ۳۔ فراغت کے بعد اب تک علمی خدمات از قسم تدریس تبلیغ، تصنیف، افتاء، خطابت، نظامت، اہتمام وغیرہ۔ ۴۔ اگر وہ ملازمت چاہتے ہیں تو کس قسم کی خدمات کی اور کس زبان میں۔ جواب جلد دیں۔

(دفتر تنظیم فضلاء دارالعلوم حقانیہ ۔ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک)
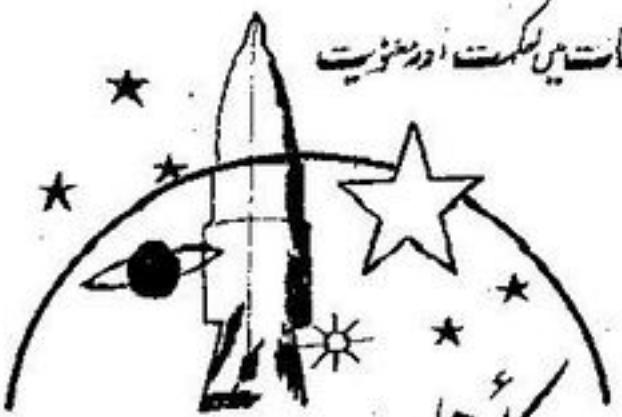
کائنات خدا کی گواہی دیتی ہے

کائنات کوڑا کرکٹ کے ڈھیر کی مانند نہیں ہے، بلکہ اس کے اندر حیرت انگیز معنویت ہے۔ یہ واقعہ صریح طور پر اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کی تخلیق و تدبیر میں کوئی ذہن کام کر رہا ہے۔ ذہنی عمل کے بغیر کسی چیز میں ایسی معنویت پیدا نہیں ہو سکتی، محض اندھے مادی عمل سے اتفاقی طور پر وجود میں آجانے والی کائنات میں تسلسل نظم اور معنویت کے پائے جانے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ کائنات اس قدر حیرت انگیز طور پر موزوں اور مناسب حال ہے کہ یہ ناقابل تصور ہے کہ یہ مناسبت اور موزونیت خود بخود محض اتفاقاً واقعہ میں آگئی ہو ـــــ چاڈ واش (CHAD VALSH) کے الفاظ ہیں:

"ایک شخص، خواہ وہ خدا کا اقرار کرنے والا ہو یا اس کا منکر ہو، جائز طور پر اس سے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ وہ دکھائے کہ اتفاق کا توازن اس کے حق میں کس طرح ہو جاتا ہے۔"

THE EVIDENCE OF GOD P-88

زمین پر زندگی کے پائے جانے کے لئے اتنے مختلف حالات کی موجودگی ناگزیر ہے۔ کہ ریاضیاتی طور پر یہ بالکل ناممکن ہے کہ وہ اپنے مخصوص تناسب میں محض اتفاقاً زمین کے اوپر اکٹھا ہو جائیں۔ اب اگر ایسے حالات پائے جاتے ہیں۔ تو لازماً یہ ماننا ہو گا کہ فطرت میں کوئی ذی شعور رہنمائی موجود ہے جو ان حالات کو پیدا کرنے کا سبب ہے۔

زمین اپنی جسامت کے اعتبار سے کائنات میں ایک ذرے کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھتی مگر اس کے باوجود وہ ہماری تمام معلوم دنیاؤں میں اہم ترین ہے۔ کیونکہ اس کے اوپر حیرت انگیز طور پر وہ حالات مہیا ہیں جو ہمارے علم کے مطابق اس وسیع کائنات میں کہیں نہیں پائے جاتے۔

سب سے پہلے زمین کی جسامت کو لیجئے۔ اگر اس کا حجم کم یا زیادہ ہوتا تو اس پر زندگی محال ہو جاتی

مثلاً کرۂ زمین اگر چاند اتنا چھوٹا ہوتا، یعنی اس کا قطر موجودہ قطر کی نسبت سے ۱/۴ ہوتا، تو اس کی کشش ثقل زمین کی موجودہ کشش کا ۱/۶ رہ جاتی۔ کشش دنیا کی اس کمی کا نتیجہ یہ ہوجاتا کہ وہ پانی اور ہوا کو اپنے اوپر روک نہ سکتی جیساکہ جسامت کی اس کمی کی وجہ سے چاند میں واقع ہوا ہے۔ چاند پر اس وقت نہ تو پانی ہے، اور نہ کوئی ہوائی کرہ ہے۔ ہوا کا غلاف نہ ہونے کی وجہ سے وہ رات کے وقت بے حد سرد ہوجاتا ہے اور دن کے وقت تنور کی مانند جلنے لگتا ہے۔ اسی طرح کم جسامت کی زمین جب کشش کی کمی کی وجہ سے پانی کی اس کثیر مقدار کو روک نہ سکتی جو زمین پر موسمی اعتدال کو باقی رکھنے کا ایک اہم ذریعہ ہے اور اسی بناء پر ایک سائنسدان نے اس عظیم توازنی پہیہ (GREAT BALANCE WHEEL) کا نام دیا ہے۔ اور ہوا کا موجودہ غلاف اڑکر فضا میں گم ہوجاتا تو اس کا حال یہ ہوتا کہ اس کی سطح پر درجہ حرارت چڑھتا تو انتہائی حد تک چڑھ جاتا۔ اور گرتا تو انتہائی حد تک گر جاتا۔ اس کے برعکس اگر زمین کا قطر موجودہ کی نسبت سے دگنا ہوتا تو اس کی کشش ثقل بھی دگنی بڑھ جاتی، کشش کے اس اضافہ کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ہوا جو اس وقت زمین کے اوپر پانچ سو میل کی بلندی تک پائی جاتی ہے۔ وہ کھنچ کر بہت نیچے تک سمٹ جاتی۔ اس کے دباؤ میں فی مربع انچ ۱۵ تا ۳۰ پونڈ کا اضافہ ہوجاتا۔ جس کا ردعمل مختلف صورتوں میں زندگی کے لئے نہایت مہلک ثابت ہوتا اور اگر زمین سورج اتنی بڑی ہوتی اور اس کی کثافت برقرار رہتی تو اس کی کشش ثقل ڈیڑھ سو گنا بڑھ جاتی۔ ہوا کے غلاف کی دبازت گھٹ کر پانچ سو میل کی بجائے صرف چار میل رہ جاتی۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ ہوا کا دباؤ ایک ٹن فی مربع انچ تک جا پہنچتا۔ اس غیر معمولی دباؤ کی وجہ سے زندہ اجسام کی نشوونما ممکن نہ رہتی۔ ایک پونڈ وزنی جانور کا وزن ایک سو پچاس پونڈ ہوجاتا، انسان کا جسم گھٹ کر گلہری کے برابر ہوجاتا اور اس میں کسی قسم کی ذہنی زندگی ناممکن ہوجاتی۔ کیونکہ انسانی ذہانت حاصل کرنے کے لئے بہت کثیر مقدار میں اعصابی ریشوں کی موجودگی ضروری ہے۔ اور اس طرح کے پھیلے ہوئے ریشوں کا نظام ایک خاص درجہ کی جسامت ہی میں پایا جاسکتا ہے۔

بظاہر ہم زمین کے اوپر ہیں۔ مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ہم اس کے نیچے سر کے بل لٹکے ہوئے ہیں۔ زمین گویا فضا میں معلق ایک گیند ہے جس کے چاروں طرف انسان بستے ہیں۔ کوئی شخص ہندوستان کی زمین پر کھڑا ہو تو امریکہ کے لوگ بالکل اس کے نیچے ہوں گے، اور امریکہ میں کھڑا ہو تو ہندوستان اس کے نیچے ہوگا۔ پھر زمین ٹھہری ہوئی نہیں ہے، بلکہ ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے مسلسل گھوم رہی ہے۔ ایسی حالت میں زمین کی سطح پر ہمارا انجام وہی ہونا چاہئے جیسے سائیکل کے پہیئے پر کنکریاں رکھ کر پہیئے کو تیزی سے گھما دیا جائے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایک خاص تناسب سے زمین کی کشش اور ہوا کا دباؤ

ہم کو ٹھہرائے ہوئے ہیں۔ زمین کے اندر غیر معمولی قوت کشش ہے جس کی وجہ سے وہ تمام چیزوں کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے اور اوپر سے ہوا کا مسلسل دباؤ پڑتا ہے۔ اسی دو طرفہ عمل نے ہم کو زمین کے گولے پر چاروں طرف لٹکا رکھا ہے۔ ہوا کے ذریعہ جو دباؤ پڑتا ہے، وہ جسم کے ہر ایک مربع انچ پر تقریباً ساڑھے سات سیر تک معلوم کیا گیا ہے۔ یعنی ایک اوسط آدمی کے سارے جسم پر تقریباً ۲۸۰ من کا دباؤ۔ آدمی اس وزن کو محسوس نہیں کرتا، کیونکہ ہوا جسم کے چاروں طرف ہے۔ دباؤ ہر طرف سے پڑتا ہے۔ اس لئے آدمی کو محسوس نہیں ہوتا۔ جیسا کہ پانی میں غوطہ لگانے کی صورت میں ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ ہوا، جو مختلف گیسوں کے مخصوص مرکب کا نام ہے، اس کے بیشمار دیگر فائدے ہیں، جن کا بیان کسی کتاب میں ممکن نہیں۔

نیوٹن اپنے مشاہدہ اور مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ تمام اجسام ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں، مگر اجسام کیوں ایک دوسرے کو کھینچتے ہیں۔ اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا چنانچہ اس نے کہا کہ میں اس کی کوئی توجیہ پیش نہیں کر سکتا۔ وائٹ ہیڈ (A.N. WHITEHEAD) اس کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے :

> "نیوٹن یہ کہہ کر ایک عظیم فلسفیانہ حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ کیونکہ فطرت اگر بے روح فطرت ہے تو وہ ہم کو توجیہ نہیں دے سکتی۔ ویسے ہی جیسے مردہ آدمی کوئی واقعہ نہیں بتا سکتا۔ تمام عقلی اور منطقی توجیہات آخری طور پر ایک مقصدیت کا اظہار ہیں۔ جبکہ مردہ کائنات میں کسی مقصدیت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔" (THE AGE OF ANALYSIS P.85)

وائٹ ہیڈ کے الفاظ کو آگے بڑھاتے ہوئے میں کہوں گا کہ کائنات اگر کسی صاحب شعور کے زیر اہتمام نہیں ہے، تو اس کے اندر اتنی معنویت کیوں پائی جاتی ہے۔

زمین اپنے محور پر چوبیس گھنٹے میں ایک چکر پورا کر لیتی ہے۔ یا یوں کہئے کہ وہ اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہی ہے، فرض کرو اس کی رفتار دو سو میل فی گھنٹہ ہو جائے اور یہ بالکل ممکن ہے۔ ایسی صورت میں ہمارے دن اور ہماری راتیں موجودہ کی نسبت سے دس گنا زیادہ لمبے ہو جائیں گے گرمیوں کا سخت سورج ہر دن تمام نباتات کو جلا دے گا۔ اور جو بچے گا وہ لمبی رات کی ٹھنڈک میں پالے کی نذر ہو جائے گا۔ سورج جو اس وقت ہمارے لئے زندگی کا سرچشمہ ہے۔ اس کی سطح پر بارہ ہزار ڈگری فارن ہائٹ کا ٹمپریچر ہے۔ اور زمین سے اس کا فاصلہ تقریباً نو کروڑ تیس لاکھ میل ہے، اور یہ فاصلہ حیرت انگیز طور پر مسلسل طور پر مسلسل قائم ہے۔ یہ واقعہ ہمارے لئے بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اگر یہ فاصلہ گھٹ جائے

مثلاً سورج نصف کے بقدر قریب آجائے تو زمین پر اتنی گرمی پیدا ہو کر اس گرمی سے کاغذ جلنے لگے، اور اگر موجودہ فاصلہ دگنا ہو جائے تو اتنی ٹھنڈک پیدا ہو کہ زندگی باقی نہ رہے۔ یہی صورت اس وقت پیدا ہو گی جب موجودہ سورج کی جگہ کوئی دوسرا غیر معمولی ستارہ آجائے۔ مثلاً ایک بہت بڑا ستارہ ہے جس کی گرمی ہمارے سورج سے دس ہزار گنا زیادہ ہے۔ اگر وہ سورج کی جگہ ہوتا تو زمین کو آگ کی بھٹی بنا دیتا ــــ۔

زمین ۲۳ درجہ کا زاویہ بناتی ہوئی فضا میں جھکی ہوئی ہے۔ یہ جھکاؤ ہمیں ہمارے موسم دیتا ہے۔ اس کے نتیجے میں زمین کا زیادہ سے زیادہ حصہ آباد کاری کے قابل ہو گیا ہے اور مختلف قسم کے نباتات اور پیداوار حاصل ہوتی ہیں۔ اگر زمین اس طرح سے جھکی ہوئی نہ ہوتی تو قطبین پر ہمیشہ اندھیرا چھایا رہتا، سمندر کے بخارات شمال اور جنوب کی جانب سفر کرتے اور زمین پر یا تو برف کے ڈھیر ہوتے یا صحرائی میدان۔ اس طرح کے اور بہت سے اثرات ہوتے جس کے نتیجے میں بغیر جھکی ہوئی زمین پر زندگی ناممکن ہو جاتی۔

یہ کس قدر ناقابلِ قیاس بات ہے کہ مادہ نے خود کو اپنے آپ اس قدر موزوں اور مناسب شکل میں منظم کر لیا۔

اگر سائنسدانوں کا قیاس صحیح ہے کہ زمین سورج سے ٹوٹ کر نکلی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ابتداً زمین کا درجۂ حرارت وہی رہا ہوگا جو سورج کا ہے، یعنی بارہ ہزار ڈگری فارن ہائٹ۔ اس کے بعد وہ دھیرے دھیرے ٹھنڈی ہونا شروع ہوئی، آکسیجن اور ہائیڈروجن کا ملنا اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتا جب تک زمین کا درجۂ حرارت گھٹ کر چار ہزار ڈگری پر نہ آجائے۔ اسی موقع پر دونوں گیسوں کے باہم ملنے سے پانی بنا۔ اس کے بعد کروڑوں سال تک زمین کی سطح اور اس کی فضا میں زبردست انقلابات ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ غالباً ایک ملین سال پہلے زمین اپنی موجودہ شکل میں تیار ہوئی۔ زمین کی فضا میں جو گیسیں تھیں ان کا ایک بڑا حصہ خلا میں چلا گیا ایک حصہ نے پانی کے مرکب کی صورت اختیار کی، ایک حصہ زمین کی تمام چیزوں میں جذب ہو گیا اور ایک حصہ ہوا کی شکل میں ہماری فضا میں باقی رہ گیا جس کا بیشتر جزو آکسیجن اور نائٹروجن ہے۔ یہ ہوا اپنی کثافت کے اعتبار سے زمین کا تقریباً دس لاکھواں حصہ ہے ـــــ کیوں نہیں ایسا ہوا کہ تمام گیسیں جذب ہو جاتیں یا کیوں ایسا نہیں ہوا کہ موجودہ کی نسبت سے ہوا کی مقدار بہت زیادہ ہوتی۔ دونوں صورتوں میں انسان زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ یا اگر بڑھی ہوئی گیسوں کے ہزاروں پونڈ فی مربع انچ بوجھ کے نیچے زندگی

پیدا ہو جاتی تو یہ ناممکن تھا کہ وہ انسان کی شکل میں نشو و نما پا سکے۔

زمین کی اوپری پرت اگر صرف دس فٹ موٹی ہوتی تو ہماری فضا میں آکسیجن کا وجود نہ ہوتا جس کے بغیر حیوانی زندگی ناممکن ہے۔ اسی طرح اگر سمندر کچھ فٹ اور گہرے ہوتے تو وہ کاربن ڈائی آکسائڈ اور آکسیجن کو جذب کر لیتے اور زمین کی سطح پر کسی قسم کی نباتات زندہ نہ رہ سکتیں۔ اگر زمین کے اوپر کی ہوائی فضا موجودہ کی نسبت سے لطیف ہوتی تو شہاب ثاقب جو ہر روز اوسطاً دو کروڑ کی تعداد میں اوپری فضا میں داخل ہوتے ہیں۔ اور رات کے وقت ہم کو چلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ زمین کے ہر حصے میں گرتے۔ یہ شہابیئے چھ سے چالیس میل تک فی سکنڈ کی رفتار سے سفر کرتے ہیں وہ زمین کے اوپر ہر آتش پذیر مادے کو جلا دیتے اور سطح زمین کو چھلنی کر دیتے۔ شہاب ثاقب کی بندوق کی گولی سے نوے گنا زیادہ رفتار آدمی جیسی مخلوق کو محض اپنی گرمی سے ٹکڑے کر دیتی مگر ہوائی کرہ اپنی نہایت موزوں دبازت کی وجہ سے ہم کو اس آتشیں بوچھاڑ سے محفوظ رکھتا ہے۔ ہوائی کرہ ٹھیک اتنی کثافت رکھتا ہے کہ سورج کی کیمیائی اہمیت رکھنے والی شعاعیں (ACTINIC RAYS) اسی موزوں مقدار سے زمین پر پہنچتی ہیں۔ جتنی نباتات کو اپنی زندگی کے لئے ضرورت ہے جس سے مضر بیکٹیریا مر سکتے ہیں، جس سے وٹامن تیار ہو سکتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ

گیسوں کا اس طرح عین ہماری ضرورتوں کے مطابق ہونا کس قدر عجیب ہے۔ زمین کی اوپری فضا چھ گیسوں کا مجموعہ ہے، جس میں تقریباً ۷۸ فیصدی نائٹروجن اور ۲۱ فیصدی آکسیجن ہے۔ باقی گیسیں بہت خفیف تناسب میں پائی جاتی ہیں۔ اس فضا سے زمین کی سطح پر تقریباً پندرہ پونڈ فی مربع انچ کا دباؤ پڑتا ہے، جس میں آکسیجن کا حصہ تین پونڈ فی مربع انچ ہے، موجودہ آکسیجن کا بقیہ حصہ زمین کی تہوں میں جذب ہے اور وہ دنیا کے تمام پانی کا ۸/۱۰ حصہ بناتا ہے۔ آکسیجن تمام خشکی کے جانوروں کیلئے سانس لینے کا ذریعہ ہے اور اس مقصد کے لئے فضا کے سوا کہیں اور سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ انتہائی متحرک گیسیں کس طرح آپس میں مرکب ہوئیں اور ٹھیک اس مقدار اور اس تناسب میں فضا کے اندر باقی رہ گئیں جو زندگی کے لئے ضروری تھا۔ مثال کے طور پر آکسیجن اگر ۲۱ فیصدی کی بجائے پچاس فیصدی یا اس سے زیادہ مقدار میں فضا کا جز ہوتا تو سطح زمین کی تمام چیزوں میں آتش پذیری کی صلاحیت اتنی بڑھ جاتی کہ ایک درخت میں آگ پکڑتے ہی سارا جنگل بھک سے اڑ جاتا۔ اسی طرح اگر اس کا تناسب گھٹ کر دس فیصدی رہتا تو ممکن ہے زندگی صدیوں کے بعد اس سے ہم آہنگی اختیار کر لیتی۔ مگر انسانی تہذیب موجودہ شکل میں ترقی نہیں کر سکتی تھی۔ اور اگر

آزاد آکسیجن بھی بقیہ آکسیجن کی طرح زمین کی چیزوں میں جذب ہو گئی ہوتی تو حیوانی زندگی سرے سے ناممکن ہو جاتی۔

آکسیجن، ہائیڈروجن، کاربن ڈائی آکسائڈ اور کاربن گیسیں الگ الگ اور مختلف شکلوں میں مرکب ہو کر حیات کے اہم ترین عناصر ہیں۔ یہی وہ بنیادیں ہیں جن پر زندگی قائم ہے۔ اس کا ایک فی ارب بھی امکان نہیں ہے، کہ وہ تمام ایک وقت میں کسی ایک سیارہ پر اس مخصوص تناسب کے ساتھ اکٹھا ہو جائیں۔ ایک عالم طبیعیات کے الفاظ ہیں:

"Science has no explanations to offer for the facts and to say it is accidental is to defy Mathematics." (P. 33)

یعنی سائنس کے پاس ان حقائق کی توجیہ کے لئے کوئی چیز نہیں ہے، اور اس کو اتفاق کہنا ریاضیات سے کشتی لڑنے کے ہم معنی ہے۔

ہماری دنیا میں بیشمار ایسے واقعات موجود ہیں جن کی توجیہہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتی کہ اس کی تخلیق میں ایک برتر ذہانت کا دخل تسلیم کیا جائے۔

پانی کی مختلف نہایت اہم خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ برف کی کثافت (DENSITY) پانی سے کم ہوتی ہے۔ پانی وہ معلوم مادہ ہے جو جمنے کے بعد ہلکا ہو جاتا ہے۔ یہ چیز بقائے حیات کیلئے زبردست اہمیت رکھتی ہے۔ اس کی وجہ سے یہ ممکن ہوتا ہے کہ برف پانی کی سطح پر تیرتا رہتا ہے۔ اور دریاؤں، جھیلوں اور سمندروں کی تہ میں بیٹھ نہیں جاتا، ورنہ آہستہ آہستہ سارا پانی ٹھوس اور منجمد ہو جائے۔ یہ پانی کی سطح پر ایک ایسی حاجب تہہ بن جاتا ہے کہ اس کے نیچے کا درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے اوپر ہی اوپر رہتا ہے۔ اس نادر خاصیت کی وجہ سے مچھلیاں اور دیگر آبی جانور زندہ رہتے ہیں۔ اس کے بعد جونہی موسم بہار آتا ہے، برف فوراً پگھل جاتی ہے۔ اگر پانی میں یہ خاصیت نہ ہوتی تو خاص طور پر سرد ملکوں کے لوگوں کو بہت بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑتا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں جب کہ امریکہ میں انڈوتھیا (ENDOTHIA) نام کی بیماری شاہ بلوط (CHEST NUT) کے درختوں پر حملہ آور ہوئی اور تیزی سے پھیلی تو بہت سے لوگوں نے جنگل کی چھتوں میں شگاف دیکھ کر کہا: "یہ شگاف اب پر نہیں ہوں گے" امریکی شاہ بلوط کی بالادستی کو ابھی تک کسی اور قسم کے اشجار نے نہیں چھینا تھا۔ اونچے درجے کی دیرپا عمارتی لکڑی اور اس طرح کے دوسرے فوائد اس کے لئے خاص تھے۔ یہاں تک کہ ۱۹۰۰ء میں ایشیا سے انڈوتھیا نام کی بیماری کا ورود ہوا، اس وقت تک یہ جنگلات کا بادشاہ خیال کیا جاتا تھا۔ مگر اب جنگلات میں یہ درخت تقریباً ناپید ہو چکا

علامہ اقبالؒ اور قادیانیت

جناب اختر راہی۔ ایم اے

علامہ اقبالؒ نے قادیانیت کے بارے میں اپنے نظریات کی تبدیلی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بقول ایمرسن صرف پتھر ہی اپنے آپ کو نہیں جھٹلا سکتے یعنی باشعور انسانوں کی آراء و افکار میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ علامہ اقبال جو قادیانیت سے اچھی توقعات وابستہ کئے ہوئے تھے۔ حقیقت آشکار ہونے کے بعد پکار اٹھے کہ قادیانی امت کو مسلمانوں سے علیحدہ اقلیت قرار دیا جائے۔ علامہ اقبال کے ان متباین نظریات کا جائزہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

علامہ اقبال ۱۸۷۳ء میں سیالکوٹ کے ایک کشمیری گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ نور محمد ایک درویش منش انسان تھے۔ علامہ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد قادیانی عقائد رکھتے تھے، قادیانی روایت کے مطابق علامہ کے والد بھی قادیانی تھے[1] صحیح یہ ہے کہ انہوں نے مرزا کی بیعت کی تھی مگر بعد میں خاموش ہو گئے تھے۔[2]

علامہ کی سیرت و کردار پر ان کے استاد مولوی میر حسن کا خاصا اثر تھا۔ مولوی صاحب سیالکوٹ کی معروف شخصیت تھے اور ان کے مرزا غلام احمد قادیانی اور حکیم نور الدین سے مخلصانہ روابط تھے۔ عبدالمجید سالک رقمطراز ہیں:

> "مرزا غلام احمد قادیانی اور مولوی حکیم نور الدین بھی شاہ صاحب (میر حسن) کی بے حد عزت کرتے تھے اور مرزا صاحب تو ایک مدت تک سیالکوٹ میں رہ بھی چکے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ شاہ صاحب کے داماد سید خورشید انور بعارضہ دق بیمار ہو گئے۔ شاہ صاحب انہیں قادیان لے گئے تاکہ حکیم نور الدین سے علاج کرائیں۔ قادیان پہنچ کر مسجد میں گئے اور اس دریچے میں جا بیٹھے جہاں مرزا صاحب

بیٹھے تھے، لوگ ان کو نہ جانتے تھے۔ انہوں نے انہیں وہاں سے اٹھا دیا۔ لیکن وہ پھر دریچے کے پاس ہی آ بیٹھے۔ مرزا صاحب آئے تو سلام کا معمولی جواب دیکر بیٹھ گئے اور متوجہ نہ ہوئے۔ شاہ صاحب نے کہا غالباً آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ مرزا صاحب نے غور سے دیکھا تو بڑی محبت اور تپاک سے ملے اور مولوی عبدالکریم سیالکوٹی کو بلا کر کہا: شاہ صاحب کو اچھی جگہ ٹھہراؤ، دو باتوں کی خاص طور پر تاکید کی۔ ایک یہ کہ شاہ صاحب کو صبح ہی صبح بھوک لگ جاتی ہے، کیوں کہ یہ عادتاً کالج جانے سے پہلے کھانا کھا لیتے ہیں، اس لئے ان کے حسب خواہش صبح ہی صبح کھانا دیا جائے۔ دوسرے انہیں اچھی کتابیں پڑھنے کیلئے دی جائیں، ساتھ ہی کہا صبح چائے میرے ساتھ پئیں۔ بہت خاطر تواضع کی اور جب شاہ صاحب واپس جانے لگے تو مرزا صاحب دو میل یکے کے ساتھ ساتھ آئے۔ پکی سڑک پر پہنچ کر کہا کہ میں کچھ باتیں علیحدگی میں کرنا چاہتا ہوں، شاہ صاحب نے ایک طرف جا کر ان کی باتیں سنیں، بعد میں معلوم نہ ہو سکا کہ کیا باتیں ہوئیں۔ نہ شاہ صاحب ہی نے بیان کیا۔[۳]"

مولوی میر حسن کے "قادیانی امت کے دماغ" حکیم نورالدین سے بھی اچھے تعلقات تھے۔ سالک ہی کی روایت ہے:

"قادیان کے مولوی حکیم نورالدین جموں میں رہتے تھے اور اکثر شاہ صاحب سے ملنے کیلئے سیالکوٹ جایا کرتے تھے۔[۴]"

میر حسن صاحب کے خاندان کے کئی افراد قادیانی عقائد رکھتے تھے اور وہ خود قادیانی راہنماؤں کے لئے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے۔

مندرجہ بالا تصریحات کے مطابق علامہ اقبال کے گھر میں قادیانی عقائد کا چرچا تھا۔ اور انکے استاد محترم بھی قادیانیوں کے بارے میں رواداری برتتے تھے۔ اس ماحول میں علامہ نے قادیانی تحریک کے مالۂ و ماعلیہ سے واقفیت حاصل کئے بغیر اچھی رائے قائم کر لی۔ ان کی یہ رائے بہت حد تک شیخ عطا محمد (برادر بزرگ) کی شفقت اور تعلیمی کفالت پر مبنی ہے۔ علامہ اقبال، عطیہ فیضی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میری خواہش ہے کہ جہاں تک جلد ممکن ہو۔ اس ملک سے بھاگ جاؤں ......

مجھے صرف اس چیز نے روک رکھا ہے کہ میں اپنے بھائی کے احسانات سے بے حد زیر بار ہوں۔[۵]"

۲۷ مئی ۱۹۰۸ء کو مرزا غلام احمد قادیانی راہیٔ ملکِ عدم ہوا اور قادیانی اُمت کی راہنمائی حکیم نورالدین بھیروی کے ہاتھ آئی۔ ڈاکٹر صاحب حکیم نورالدین سے اکثر استفسار کرتے تھے۔ مثلاً:

"جب علامہ اقبال کی دوسری شادی ہوگئی اور ابھی رخصتی باقی تھی، ڈاکٹر جاوید اقبال کی والدہ کے بارے میں علامہ اقبال کو گمنام خطوط ملے کہ ان کا کردار بے داغ نہیں ہے۔ اس دور میں علامہ نے طلاق دینے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن بعد ازاں تحقیق کے بعد تمام الزامات جھوٹ نکلے تو علامہ بیگم کو لانے پر تیار ہوگئے، انہیں شبہ تھا کہ وہ چونکہ طلاق دینے کا ارادہ کر چکے تھے۔ اس لئے مبادا شرعاً طلاق ہی ہو چکی ہو۔ انہوں نے مرزا جلال الدین کو مولوی حکیم نورالدین کے پاس قادیان بھیجا کہ مسئلہ پوچھ آؤ۔"

علامہ اقبال نے بڑے صاحبزادے آفتاب احمد کو قادیان بغرضِ تعلیم بھیجا تھا۔ ۱۹۱۱ء میں علی گڑھ یونیورسٹی میں "ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر" کے عنوان سے لیکچر دیا۔ جس میں انہوں نے کہا:

"میری رائے میں قومی سیرت کا وہ اسلوب جس کا سایہ عالمگیر ذات نے ڈالا ہے۔ ٹھیٹھ اسلامی سیرت کا نمونہ ہے۔ اور ہماری تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ اس نمونے کو ترقی دی جائے اور مسلمان ہر وقت اسے پیشِ نظر رکھیں۔ پنجاب میں اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ اس جماعت کی شکل میں ظاہر ہوا جسے فرقہ قادیانی کہتے ہیں۔"

کشمیر میں ۷۷٪ مسلمان آبادی تھی، مگر ڈوگرہ حکمرانوں نے اکثریت کو تشدد اور ظلم و ستم کا نشانہ بنا رکھا تھا۔ مسلمان معاشی طور پر پسماندہ، سیاسی طور پر غیر منظم اور تعلیمی لحاظ سے ہندو رعایا سے کوسوں پیچھے تھے، کشمیر کی فوج میں ڈوگروں کے علاوہ راجپوت، نیپال کے گورکھے اور پنجاب کے سکھ تو بھرتی ہو سکتے تھے، لیکن کسی کشمیری مسلمان کو بھرتی کرنے کی کلیتاً ممانعت تھی، مسلمان بنیادی حقوق سے محروم تھے، عبادات تک آزادی سے ادا نہیں کر سکتے تھے، جو غیر مسلم حلقہ اسلام میں داخل ہوتا اس کی جائیداد ضبط کر لی جاتی تھی، پریس کی آزادی عنقا تھی۔ مختصر یہ کہ جنگل کا قانون تھا۔ بات [illegible] کرتے ہیں ۱۹۳۱ء کے نصف اول میں مہاراجہ کی حکومت نے مسلمانوں پر ظلم و ستم کے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ ہزاروں افراد کو پابندِ سلاسل و زنداں کیا گیا۔ ریاستی مسلمانوں میں تحریکِ آزادی پھیلنے لگی اور ریاست میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک مظاہرے ہونے لگے۔ حکومت نے حالات کو بگڑتے دیکھ کر برطانوی فوج طلب کر لی۔

کشمیر میں تحریکِ آزادی کی تائید و حمایت کے لئے شمالی ہند کے مسلمانوں نے دو تحریکیں شروع

گیں۔ پہلی تحریک کی نوعیت انقلابی اور مجاہدانہ تھی جو مجلس احرار اسلام کی سرکردگی میں جاری ہوئی۔ مجلس احرار اسلام نے ۱۹۳۱ء کے وسط میں اس امر کا فیصلہ کیا کہ وہ کشمیری مسلمانوں کو جائز حقوق دلانے کی خاطر کسی بڑے سے بڑے اقدام سے بھی گریز نہیں کرے گی۔ ابتدا میں احرار کے ایک وفد نے مولوی مظہر علی اظہر کی رہنمائی میں وزیر اعظم کشمیر سے ملاقات کی لیکن گفت و شنید بے نتیجہ رہی۔ ناکام گفت و شنید کے بعد احرار نے عوامی سطح پر ایک تحریک چلائی اور حکومت کے امتناعی احکام کے باوجود ہزاروں کی تعداد میں قافلہ در قافلہ رضاکار کشمیر جانے لگے۔ جو رضاکار سرحد عبور کر کے کشمیر کی حدود میں داخل ہوتے تھے وہ جیل میں ڈال دیئے جاتے تھے مگر ان ہتھکنڈوں سے تحریک رکنے کی بجائے مزید تیز ہوتی گئی، آخر برطانوی حکومت نے مہاراجہ کی درخواست پر ریاست کی حدود میں داخل ہونے سے پہلے ہی رضاکاروں کی گرفتاری شروع کر دی۔[۸]

کشمیری مسلمانوں کے لئے جو دوسری تحریک چلی وہ آئینی اور قانونی تھی اور یہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کہلائی۔ آل انڈیا کشمیر کمیٹی ۲۵ جولائی ۱۹۳۱ء کو شملہ میں تشکیل پائی۔ کمیٹی کے پہلے سربراہ قادیانی امت کے سربراہ مرزا بشیر الدین محمود احمد چنے گئے۔ علامہ اقبال کے الفاظ میں:

"کمیٹی کی تشکیل کشمیر میں غیر متوقع واقعات کے اچانک رونما ہونے پر صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے ہوئی تھی اور اس وقت یہ خیال تھا کہ اس قسم کی کمیٹی کی ضرورت بہت جلد ختم ہو جائے گی، اس لئے کمیٹی کا کوئی نظام مرتب نہیں کیا گیا تھا، اور صدر کو آمرانہ اختیارات دے دئے گئے تھے۔"[۹]

آل انڈیا کشمیر کمیٹی کا مقصد مظلوم کشمیری مسلمانوں کی امداد تھا، مگر بشیر الدین محمود نے کمیٹی کو کشمیر کے معاملات تک محدود رکھنے کی بجائے قادیانیت کا Emage بلند کرنے کے لئے آلۂ کار بنا لیا، انہوں نے ایک قادیانی عبدالرحیم درد کو کمیٹی کا سیکرٹری نامزد کر دیا اور قادیان میں ۹ر اگست ۱۹۳۱ء کو کمیٹی کا مرکزی دفتر قائم کر دیا۔

کشمیر کمیٹی میں قادیانیوں کا رول محض مسلمانوں سے ہمدردی کے سبب سے نہ تھا بلکہ ناقابل تردید تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی وہ اپنے آقا "برطانیہ" کا حق نمک خواری ادا کر رہے تھے۔ برصغیر کے مسلمانوں کے اجتماعی مسائل سے قادیانی ہمیشہ غیر متعلق رہے، انہوں نے برطانوی اقتدار کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔ ۱۹۱۸ء کے بعد جب مسلمانان برصغیر ترکی کے خلاف برطانوی جارحیت پر سراپا احتجاج تھے اور ملک کے کونے کونے میں خلافت کمیٹی کی شاخیں قائم ہو رہی تھیں تو ترکی کی شکست اور بغداد پر برطانوی قبضے کی خوشی میں قادیانی امت نے "جشن فتح" منایا اور چراغاں کیا گیا۔[۱۰]

برصغیر کے مسلمانوں کا اہم مسئلہ حصولِ آزادی تھا تاکہ وہ اسلامی اصولوں کے مطابق اپنی زندگی گزار سکیں۔ قادیانی امت کا ردِعمل یہ تھا کہ برطانوی اقتدار قائم رہے۔ ۱۹۳۵ء میں وائسرائے ہند لارڈ ولنگڈن سے سر ظفر اللہ خان کی والدہ نے ملاقات کی، اور سر ظفر اللہ خان کی والدہ نے لارڈ ولنگڈن کو کہا:

"حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو ہمارے سلسلہ کے بانی تھے، ہمیں تعلیم دی ہے کہ ہم سلطنتِ برطانیہ کے وفادار رہیں اور اس کے لئے دعا کرتے رہیں، کیونکہ اسکی عملداری میں ہمیں مذہبی آزادی حاصل ہے اور ہم بغیر خوف وخطر کے اپنے دین کے احکام بجا لا سکتے ہیں[۱۱]"

جب انگریزوں کا بوریا بستر سمیٹ کر جانا یقینی ہو گیا تو انہوں نے مسلمانانِ برصغیر کی خواہش اور مطالبے کے برعکس کانگریس کے اکھنڈ بھارت کا ساتھ دیا۔ مگر جب ان کی تمام سازشانہ کارروائیوں کے باوجود مسلمانانِ برصغیر کی خواہش "پاکستان" کی صورت میں متشکل ہو گئی تو اس کے بعد بھی انہوں نے اکھنڈ بھارت کی جدوجہد جاری رکھی جو تاحال جاری ہے۔

اسلامی مملکت میں قادیانیوں کا مستقبل تاریک ہے اور وہ اُن فائدوں سے محروم ہو سکتے ہیں جو مسلمانوں کے نام پر اُن کو حاصل ہیں۔

تاریخی پس منظر میں کشمیر کمیٹی کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اُس زمانے میں برطانوی حکومت کو یہ خدشہ لاحق تھا کہ روس کشمیر کے راستے اپنے اشتراکی اثرات برصغیر میں نہ پھیلا دے اس لئے سرحدی علاقوں میں ایسی وفادار جماعتوں کی نشوونما ضروری تھی جو ایک طرف برطانوی حکومت کی وفاداریوں دوسری طرف تمام سرگرمیوں سے برطانوی حکومت کو باخبر رکھیں۔ اس مقصد کے لئے قادیانیوں سے بہتر کوئی دوسری جماعت نہ ہو سکتی تھی[۱۲]

کمیٹی کی طرف سے کشمیری مسلمانوں کی جمہوری آزادیوں کے لئے برصغیر میں کشمیر ڈے (KASHMIR DAY) بنایا گیا۔ لاہور میں علامہ اقبال کی صدارت میں جلسہ ہوا، جلوس نکالا گیا۔ جلسہ وجلوس میں ایک لاکھ افراد نے شرکت کی[۱۳]

مرزا بشیر الدین کے مشکوک طرزِ عمل کو دیکھتے ہوئے باخبر مسلمانانِ کشمیر چنداں خوش نہ تھے۔ علماء کا طبقہ قادیانی امت کی ریشہ دوانیوں سے اس حد تک بیزار تھا کہ انہیں ہر حال میں تحریکِ کشمیر سے علیحدہ رکھنا چاہتا تھا۔ میر واعظ محمد یوسف شاہ نے اپنے ساتھی کشمیری راہنماؤں شیخ عبداللہ وغیرہ پر واضح کر دیا تھا کہ قادیانی امت کو سیاسی تحریک سے جدا رکھا جائے۔ کمیٹی کے ارکان پر بھی حقیقت واضح ہو گئی کہ مرزا صاحب

کمیٹی کی آڑ میں قادیانیت کی توسیع کے ارادے رکھتے ہیں، آخر لاہور کے [۱۳] ارکان کمیٹی نے بشیر الدین محمود کو ایک تحریر بھیجی کہ وہ کمیٹی کا اجلاس طلب کر کے از سر نو انتخاب کرائیں۔

۷ مئی ۱۹۳۳ء کو اجلاس ہوا اور مرزا صاحب نے از خود استعفیٰ پیش کیا جو منظور ہو گیا۔ نئے انتخابات تک علامہ اقبالؒ کو قائم مقام صدر اور ملک برکت علی کو سیکرٹری مقرر کیا گیا اور ایک دستور کمیٹی بنا دی گئی۔

نئی کمیٹی کا ایک دوسرا اجلاس ہوا اور آل انڈیا کشمیر کمیٹی کو توڑنے کا اعلان کر دیا گیا۔ ایسا کیوں ہوا؟ ڈاکٹر اقبالؒ نے ۲۰ جون ۱۹۳۳ء کو اخباری بیان سے وضاحت کی:

"بد قسمتی سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنے مذہبی فرقے کے امیر کے سوا کسی دوسرے کا اتباع کرنا سرے سے گناہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ احمدی وکلاء میں سے ایک صاحب نے جو میر پور کے مقدمات کی پیروی کر رہے تھے۔ حال ہی میں اپنے ایک بیان میں واضح طور پر اس خیال کا اظہار کر دیا۔ انہوں نے صاف طور پر کہا کہ وہ کسی کشمیر کمیٹی کو نہیں مانتے اور جو کچھ انہوں نے یا ان کے ساتھیوں نے اس ضمن میں کیا وہ ان کے امیر کے حکم کی تعمیل تھی۔ مجھے اعتراف ہے کہ تمام احمدی حضرات کا یہی خیال ہوگا۔ اور اس طرح میرے نزدیک کشمیر کمیٹی کا مستقبل مشکوک ہو گیا۔" [۱۴]

کشمیر کمیٹی کے ارکان میں نظامِ عمل کے بارے میں "بے تکے اختلافات" پیدا ہو گئے تو:

"ان حالات کے پیشِ نظر مجھے اس امر کا یقین ہے کہ کمیٹی میں اب ہم آہنگی کے ساتھ کام نہیں ہو سکتا اور ہم سب کا مفاد اسی میں ہے کہ موجودہ کشمیر کمیٹی کو ختم کر دیا جائے۔" [۱۵]

علامہ اقبالؒ نے اس بکھیڑے سے علیحدگی اختیار کر لی تاہم کشمیر کمیٹی کی ضرورت و اہمیت کے لئے نئی کشمیر کمیٹی کی تجویز پیش کی۔ چنانچہ مسلمانانِ لاہور نے ایک نئی کشمیر کمیٹی بنا لی۔ قادیانی امت یہ تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں تھی کہ پہلی "آل انڈیا کشمیر کمیٹی" ختم ہو چکی ہے۔ انہوں نے ایک نئی چال چلی اور ۳ ستمبر ۱۹۳۳ء کو لاہور میں سابق کشمیر کمیٹی کے بعض راہنماؤں کا جلسہ ہوا، اور علامہ اقبالؒ کو صدارت کی پیشکش کی مگر علامہ نے قادیانی ریشہ دوانیوں کے پیشِ نظر علیحدہ رہنا ہی مناسب خیال کیا۔ بعد میں قادیانی امت نے سابق آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی بجائے "آل انڈیا کشمیر ایسوسی ایشن" کا نام دیا جو برائے نام ۱۹۳۷ء تک موجود رہی۔

اس علامہ اقبالؒ نے عمیق غور و فکر کے بعد "قادیانیت اور اسلام" کے موضوع پر بیان دیا وہ لکھتے ہیں:

"اسلام لازماً ایک دینی جماعت ہے جس کے حدود مقرر ہیں یعنی وحدتِ الوہیت

پر ایمان، انبیاء پر ایمان اور رسول کریم کی ختم رسالت پر ایمان، دراصل یہ آخری یقین ہی وہ حقیقت ہے جو مسلم اور غیر مسلم کے درمیان وجہ امتیاز ہے اور اس امر کیلئے فیصلہ کن ہے کہ فرد یا گروہ ملت اسلامیہ میں شامل ہے یا نہیں۔ مثلاً برہمو سماج خدا پر یقین رکھتے ہیں اور رسول کریم کو خدا کا پیغمبر مانتے ہیں۔ لیکن انہیں ملت اسلامیہ میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ قادیانیوں کی طرح وہ انبیاء کے ذریعہ وحی کے تسلسل پر ایمان رکھتے ہیں اور رسول کریم کی ختم نبوت کو نہیں مانتے جہاں تک مجھے معلوم ہے کوئی اسلامی فرقہ اس حد فاصل کو عبور کرنے کی جسارت نہیں کر سکا۔ ایران میں بہائیوں نے ختم نبوت کے اصول کو صریحاً جھٹلایا، لیکن ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ وہ الگ جماعت ہیں اور مسلمانوں میں شامل نہیں ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ اسلام بحیثیت دین کے خدا کی طرف سے ظاہر ہوا، لیکن اسلام بحیثیت سوسائٹی یا ملت کے رسول کریم کی شخصیت کا مرہون منت ہے۔ میری رائے میں قادیانیوں کے سامنے صرف دو راہیں ہیں یا وہ بہائیوں کی تقلید یا ختم نبوت کی تاویلوں کو چھوڑ کر اس اصول کو پورے مفہوم کے ساتھ قبول کر لیں۔ ان کی جدید تاویلیں محض اس غرض سے ہیں کہ ان کا شمار حلقۂ اسلام میں ہو تاکہ انہیں سیاسی فوائد پہنچ سکیں [۱۷]"

ایک دوسرے مضمون میں رقمطراز ہیں:

"مسلمان ان تحریکوں کے معاملہ میں زیادہ حساس ہیں جو اس کی وحدت کیلئے خطرناک ہیں۔ چنانچہ ہر ایسی مذہبی جماعت جو تاریخی طور پر اسلام سے وابستہ ہو۔ لیکن اپنی بنا نئی نبوت پر رکھے اور بزعم خود اپنے الہامات پر اعتقاد نہ رکھنے والے تمام مسلمانوں کو کافر سمجھے مسلمان اسے اسلام کی وحدت کے لئے ایک خطرہ تصور کرے گا۔ اور یہ اس لئے کہ اسلامی وحدت ختم نبوت سے ہی استوار ہوتی ہے [۱۸]"

علامہ اقبالؒ نے مضامین و بیانات کے علاوہ اپنے کلام میں بھی "قادیانیت" کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا ہے۔

"ضرب کلیم" پہلی بار جولائی ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔ اس میں "نبوت" کے عنوان سے لکھتے ہیں ؎

میں نہ عارف نہ مجدد نہ محدث نہ فقیہ	مجھ کو معلوم نہیں کیا ہے نبوت کا مقام
ہاں مگر عالم اسلام پہ رکھتا ہوں نظر	فاش ہے مجھ پہ ضمیر فلک نیلی فام

عصرِ حاضر کی شبِ تار میں دیکھی میں نے — یہ حقیقت کہ ہے روشن صفتِ ماہِ تمام

وہ نبوت ہے مسلماں کیلئے برگِ حشیش — جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

اسی طرح "انگریز کی پرستار امت" کیطرف بایں الفاظ اشارہ کیا ہے

فتنۂ ملتِ بیضا ہے امامت اسکی — جو مسلماں کو سلاطین کا پرستار کرے

"پس چہ باید کرد" میں خوب لکھا ہے

گفت دین را رونق از محکومی است — زندگانی از خودی محرومی است

دولتِ اغیار را راحت شمرد — رقص ہا گردِ کلیسا کرد و مرد

ماخذ و حوالہ جات

حوالہ	مصنف / ناشر
۱۔ تاریخ احمدیت جلد ہشتم صـ ۱۹	دوست محمد شاہد - ربوہ
۲۔ تحریک احمدیت اور علامہ اقبالؒ صـ ۱۴	اختر حسین گیلانی - احمدیہ انجمن اشاعت اسلام - لاہور
۳۔ ذکرِ اقبال صـ ۴۳	عبدالمجید سالک - بزمِ اقبال لاہور
۴۔ ذکرِ اقبال صـ ۷	" " " "
۵۔ اقبال نامہ جلد ۲	اقبال
۶۔ ذکرِ اقبال صـ ۱۱	عطیہ فیضی - اقبال اکیڈمی کراچی۔
	سالک
۷۔ ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر	ڈاکٹر اقبال (ترجمہ مولانا ظفر علی خان) صـ ۱
۸۔ تفصیل کے لئے "تحریکِ کشمیر"	تاج الدین انصاری - مجلسِ احرارِ اسلام - ملتان
۹۔ حرفِ اقبال صـ ۲۲۱	ڈاکٹر اقبال
۱۰۔ منیر رپورٹ صـ ۱۹۶	
۱۱۔ میری والدہ صـ ۸۳	سر ظفر اللہ خان - محمد احمد اکیڈمی رام گلی ۳ لاہور
۱۲۔ تفصیل کیلئے "مسئلہ کشمیر"	ممتاز احمد - المحراب - سمن آباد - لاہور
۱۳۔ کشمیر کی کہانی	ظہور احمد - مکتبہ لاہور - بیڈن روڈ - لاہور
۱۴۔ حرفِ اقبال صـ ۲۲۱	ڈاکٹر اقبال
۱۵۔ ایضاً صـ ۲۲۲	" "
۱۶۔ " صـ ۱۳۶ ـ صـ ۱۳۷	" "
۱۷۔ " ۱۰۲ ۱۲۳	" "

اللہ تعالیٰ کی طرف اضافت اعضاء سے کیا مراد ہے

تصنیف : امام ابن حزم ظاہریؒ
ترجمہ : مولانا احمد عبد الحلیم کانپوری

امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب " الفصل بین الاھواء والملل والنحل " میں اللہ تعالیٰ کی طرف اعضاء بدنیہ کی اضافت کی محاورات عرب کے مطابق جو توضیح فرمائی ہے، میں اس کا ترجمہ پیش کرتا ہوں۔ امید ہے کہ اس سے قرآن وحدیث کی تفسیر میں بہت آسانی ہوگی۔ وہ فرماتے ہیں :

قرآن مجید اور احادیث میں بعض اعضاء کو اللہ تعالیٰ کی طرف مضاف دیکھ کر اس امت میں ایک فرقہ مجسمہ پیدا ہوگیا جو معاذ اللہ اللہ تعالیٰ کے جسم کا قائل ہوگیا۔ مگر اس فرقہ کے پاس سوائے ان آیات و احادیث کے کوئی دلیل نہ تھی جس سے وہ اپنا دعویٰ ثابت کرتا۔ مگر درحقیقت یہ اس کی انتہائی غلط فہمی اور لغت عرب سے بے خبری تھی۔ اسلام سے نسبت رکھنے والے فرقوں میں بجز فرقہ مجسمہ کے کوئی بھی اللہ تعالیٰ کے اعضاء کا قائل نہ تھا۔ اور اس کا رد وجواب علماء امت نے دیدیا تھا، لیکن یہ جواب چونکہ عربی کی ضخیم کتابوں میں ہے۔ اس لئے عربی نہ جاننے والے عوام بلکہ درس نظامیہ تک محدود رہنے والے علماء سے بھی پوشیدہ رہا۔ تجسیم باری تعالیٰ کا صرف اسلام ہی منکر ہے ورنہ دوسرے مذاہب مثلاً یہود و نصاریٰ اور سب سے زیادہ آریہ اور سناتن دھرمی ہندو اسی حماقت کے قائل ہیں اور چونکہ اہل اسلام کے اعتراضات سے انہیں بھی اپنی ان حماقتوں کے سمجھنے کا شعور پیدا ہوگیا ہے۔ لیکن تقلید وتعصب کی جو زنجیر لعنت گلوگیر ہے وہ انہیں اس سے رہا نہیں ہونے دیتی۔ اس لئے انہوں نے جواباً اہل اسلام پر بھی یہی الزام عائد کیا ہے کہ تمہارے یہاں بھی اعضائے باری تعالیٰ کی تصریح موجود ہے۔ مگر یہ محض ان کا وہم ہے۔ چنانچہ ذیل میں آیات واحادیث پیش کرکے ان کے صحیح وظاہر معنی بتائے جاتے ہیں جو لغت، ومحاورۂ عرب کے مطابق ہیں اور اس کے خلاف جو کچھ ہے وہ محض رائے وقیاس ہے، جو منقولات میں ہرگز مقبول نہیں۔

وجہ | قرآن مجید میں ہے۔ "ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام۔" (یعنی فنائے عالم کے بعد صرف آپکا پروردگار ہی باقی رہے گا جو صاحب عزت و رفعت ہے۔) لفظ "وجہ" عربی میں بہت سے معانی میں مستعمل ہے۔ جن میں سے ایک معنی "چہرہ" بھی ہیں۔ لیکن یہاں تمام دوسرے معانی کو چھوڑ کر صرف چہرہ مراد لینا ایک بے دلیل دعویٰ ہے۔ عرب کا محاورہ ہے کہ کسی کل کے جزو اشرف کو یا عام کے خاص کو ذکر کرکے اس سے کل یا عام ہی کو مراد لیتے ہیں اس لئے یہاں بھی اور قرآن مجید بھر میں جہاں کہیں بھی "وجہ" کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے وہاں وجہ اسی محاورہ و اصل کے مطابق ہے۔ اور وجہ اللہ سے مراد صرف اللہ ہی ہے۔ اسی کے مطابق دوسری جگہ ارشاد ہے: انما نطعمکم بوجہ اللہ۔ اے لئے (یعنی ہم تو تمہیں محض اللہ ہی کے خوش کرنے کو کھلاتے ہیں اور تم سے اس کا کوئی بدل یا شکرانہ تک نہیں چاہتے اور یہ مطلب نہیں کہ ہم تمہیں اللہ کے چہرہ کے لئے کھلاتے ہیں۔ اسی طرح اینما تولوا فثم وجہ اللہ۔ بھی ہے۔ یعنی تم (نماز میں) جدھر بھی رخ کرو ادھر ہی اللہ ہے۔ یعنی وہ اپنی طرف متوجہ ہونے والے کو جانتا ہے اور اس کی توجہ کو قبول فرماتا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوگیا کہ وجہ کی اضافت جب اللہ کی طرف ہوگی تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ یہاں غیر اللہ مراد نہیں ہے اللہ ہی مراد ہے۔

ید ویمین | اسی طرح ید کے معنی ہاتھ ہیں۔ اور یہ لفظ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ مثلاً ید اللہ فوق ایدیہم۔ یعنی (حدیبیہ کی بیعت رضوان میں) اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر تھا۔ لما خلقت بیدی۔ (یعنی اے ابلیس تونے اسے سجدہ کیوں نہ کیا) جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا۔ مما عملت ایدینا انعاماً۔ (یعنی ہمارے ہاتھوں سے بنائی ہوئی مخلوق میں چوپائے بھی ہیں۔) بل یداہ مبسوطتان۔ یعنی بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں۔ اور حدیث صحیح میں ہے۔ "عن یمین الرحمٰن" "وکلتا یدیہ یمین"۔ یعنی رحمان کے داہنے ہاتھ ہے۔" اور اس کے دونوں ہاتھ داہنے ہیں۔ یہاں بھی وجہ کی طرح ید ویمین کا استعمال ہوا ہے۔ مگر ان دونوں لفظوں سے بھی مراد اللہ ہی ہے۔

عین | اور اسی طرح عین جس کے معنی آنکھ ہیں اس کا استعمال بھی اللہ کے معنی میں ہوا ہے۔ "لتصنع علی عینی" (تاکہ میری آنکھ کے سامنے تمہاری پرورش کی جائے) انک باعیننا۔ (بیشک تم میری آنکھوں کے سامنے ہو) چنانچہ یہاں بھی عین سے مراد اللہ ہی ہے۔ یعنی تاکہ میرے سامنے تمہاری پرورش کی جائے اور بیشک تم میرے سامنے ہو یعنی اللہ کے۔

جنب | اسی طرح جنب بمعنی پہلو ہے مگر اس کا استعمال اس آیت میں اسی طرح ہوا ہے۔ یاحسرتا علی ما فرطت فی جنب اللہ۔ یعنی قیامت میں کوئی سزا یافتہ یہ کہے گا کہ (وائے حسرت میں نے

اللہ کے کاموں میں انتہائی کوتاہی کی) یعنی میں نے اس کی عبادت و اطاعت میں کوتاہی کی بجائے اس کے غیر اللہ کی عبادت میں مبتلا ہو گیا۔

یمین اور حدیث میں جو یمین الرحمٰن اور کلتا یدیہ یمین آیا ہے اس کی نظیر بھی قرآن مجید میں ہے۔ وما ملکت ایمانکم۔ یعنی (تمہارے داہنے ہاتھ جس چیز کے مالک ہوں) ظاہر ہے کہ اس کے معنی صاف یہی ہیں کہ جس کے تم مالک ہو۔ کیونکہ ہاتھ مالک نہیں ہوتے۔ بلکہ لغت عرب میں یمین ایسے مقام پر بولا جاتا ہے۔ جہاں کسی افضل کا حق و حصہ مراد ہوتا ہے۔ شماخ کہتا ہے ؎

اذا ما رایۃ رفعت لمجد تلقاھا عرابۃ بالیمین

یعنی جس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا جھنڈا بلند ہوا تو اسے عرب نے داہنے ہاتھ سے لیا۔ یعنی انہوں نے اس جھنڈے کو اعلیٰ درجہ کی سعی و عقیدت کے ساتھ مکمل طور پر لیا۔ اسی طرح جہاں کہیں یمین اللہ کیطرف مضاف ہے اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ جسکا ظہور یمین سے ہوا ہے، وہ مکمل و اعلیٰ ہے کیونکہ جو کام داہنے ہاتھ سے ہوتا ہے، وہ بہ نسبت بائیں ہاتھ کے کام کے مکمل ہوتا ہے۔

قدم و رجل اور اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیث میں ہے کہ ان جہنم لاتمتلیٔ حتی یضع فیھا قدمہ۔ یعنی جہنم سیر نہ ہو گی تاوقتیکہ اللہ تعالیٰ اس میں اپنا قدم نہ رکھ دے۔ اور نیز یہ بھی یہ بھی حدیث میں ہے کہ حتی یضع فیھا رجلہ۔ یعنی جہنم سیر نہ ہو گی تاوقتیکہ وہ اس میں اپنا رجل نہ رکھ دے اور رجل کے معنی پاؤں بھی ہیں، اور رجل کے معنی جماعت بھی ہیں۔ اور اس کے وہی معنی ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دوسری صحیح حدیث میں بیان فرمائے ہیں۔ آپ نے خبر دی ہے کہ: ان اللہ تعالیٰ یعد یوم القیامۃ یخلق خلقا یدخلھم الجنۃ والنار لکل واحدۃ منکما ملوٴھا۔ قیامت کے بعد اللہ تعالیٰ ایک مخلوق پیدا کریگا۔ (پھر جنت و دوزخ سے فرمائے گا) کہ تم دونوں میں سے ہر ایک کے لئے کوئی نہ کوئی بھرنے والی چیز ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قیامت کے بعد جنت و دوزخ کیلئے کوئی مخلوق پیدا کی جائے گی جو ان دونوں کو بھر دے گی۔ لہٰذا اس حدیث میں قدم کے وہی معنی ہیں جو اس آیت میں ہیں۔ ان لھم قدم صدق عند ربھم۔ یعنی (مومنین کو خوشخبری سنا دیجئے کہ ان کے رب کے یہاں ان کے لئے قدم صدق ہے۔ یعنی ان کا گذشتہ صدق ہے، جسکی انہیں جزا ملے گی۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ یہاں قدم بمعنی گذشتہ ہے، اور قدم کے یہی معنی حدیث مذکورہ میں بھی ہیں۔ اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ وہ امت جس سے جہنم بھری جائے گی وہ علم الٰہی میں قدم یعنی متقدم و گذشتہ ہے اور ظاہر ہے کہ ہر ہونے والی چیز اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔ اور رجل کے معنی یہی ہیں، کیونکہ لغت میں رجل جماعت کو بھی

کہتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ جہنم میں اپنی (پیدا کی ہوئی) ایک جماعت رکھ دے گا جس سے وہ بھر جائے گی۔
خلاصہ یہ ہوا کہ اس حدیث میں قدم و رجل کے معنی پاؤں نہیں ہیں بلکہ قدم بمعنی گذشتہ یعنی وہ جماعت جو اللہ کے علم میں پہلے سے گذری ہوئی ہے۔ اور رجل بمعنی جماعت۔

اِصْبَع اور اسی طرح یہ حدیث صحیح بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ان قلب مؤمن بین اصبعین من اصابع اللہ عزوجل۔ بیشک مومن کا قلب اللہ تعالیٰ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان میں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی تدابیر و نعم میں سے قلب مومن دو تدبیروں اور دو نعمتوں کے درمیان میں ہے کہ یا تو اُسے کفایت و فراغت میسّر ہے جس سے اُسے مسرّت حاصل ہے اور یا اُسے تنگی و مصیبت ہے جس پر اُسے اجر و ثواب ملتا ہے اور چونکہ لغت میں اِصْبَع کے معنی انگلی بھی ہیں اور نعمت بھی۔ اور چونکہ باریک و دقیق امور انگلی سے انجام پذیر ہوتے ہیں۔ اس لئے یہاں بطور استعارہ تدبیر کیلئے اِصْبَع کا لفظ لایا گیا جسطرح یمین بمعنی دستِ راست عظیم الشان امور کی تکمیل کے اظہار کے لئے لایا جاتا ہے اور چونکہ اِصْبَع بمعنی نعمت بھی ہے۔ اس لئے حدیث کا واضح مطلب یہ ہوا کہ مومن کا قلب اللہ تعالیٰ کی تدبیر و توفیق کے درمیان میں ہے اور ظاہر ہے کہ توفیق انتہائی نعمت ہے کہ اگر یہ نہ ہو تو اس عالم ظلمانی میں کوئی خیر ممکن نہیں اور بغیر خیر کے نجات ممکن نہیں۔ اور تدبیر و توفیق ہر دو امور اس کے احکام میں سے ہیں۔

صورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: ان اللہ یبدو للمؤمن یوم القیامۃ فی غیر الصورۃ التی عرفوھا۔ (یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مومن کیلئے اُس صورت کے خلاف ظاہر ہوگا جس صورت میں وہ اُسے جانتے ہیں۔) اور یہ بالکل بدیہی و ظاہر ہے کہ قیامت میں خوف و ہول کی وہ صورتِ حال نظر آئے گی جو بالکل اس کے خلاف ہوگی جو دنیا میں خیال کی جاتی ہے۔ کیونکہ اسی حدیث میں یہ جملہ کہ: غیر الصورۃ التی عرفوھا۔ (جو اُس صورت کے خلاف ہوگی جو لوگ پہچانتے تھے) اس پر دلالت کرتا ہے کیونکہ ہمیں بدیہی و ضروری علم ہے کہ ہم دنیا میں اللہ تعالیٰ کی کسی صورت کو نہیں جانتے لیکن دنیا میں خوف و دہشت، ہول کے بیشمار طریقوں کا ہر ایک کو علم ہے اور اسی کے مطابق وہ قیامت کے ہول و دہشت کو بھی خیال کرتا ہے۔ لیکن حدیث مذکور سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے حالاتِ خوف و دہشت بالکل جداگانہ ہوں گے۔ اس لئے اس حدیث میں یقیناً صورت کے یہی معنی ثابت ہو گئے جو بیان کئے گئے اور بعینہٖ یہی کلام اس صحیح حدیث کے متعلق بھی ہے کہ: خلق اللہ آدم علی صورتہ۔ یعنی (اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی پسندیدہ صورت پر پیدا کیا۔) چنانچہ یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے صورت کو بطور

اضافت لاکر اپنی طرف مضاف فرمایا ہے، جس کا یہ مطلب ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی مملوکہ صورت پر پیدا کیا۔ اور اس لیے وہ صورت مراد لی ہے، جو اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے لئے پسند فرمائی اور اسی صورت پر انہیں پیدا کیا۔ یوں تو اللہ تعالیٰ نے جس نوع کو جو بھی صورت عطا فرمائی وہ اپنے ہی اختیار و پسند سے عطا فرمائی، لیکن جسطرح انسان کو اس نے اپنی بہت سی مخلوقات پر شرف دیا اسی طرح اس کی صورت کو بھی بہت سی مخلوقات کی صورت پر شرف دیا اور اس کی صورت کو سب کی صورت سے زیادہ پسند فرمایا۔ اور اسی شرف، خصوصیت کی وجہ سے اس کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے۔ جس طرح جو چیز کسی طبقہ میں کوئی فضیلت رکھتی ہے۔ اُسے اللہ تعالیٰ کیطرف منسوب کیا جاتا ہے۔ مثلاً کعبہ کو بیت اللہ کہا جاتا ہے۔ حالانکہ جتنے بیوت و مکانات ہیں۔ سب ہی اللہ تعالیٰ کے مملوک ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی مکان یا بیت اللہ نہیں کہا جاتا۔ جس طرح مسجد حرام کو بیت اللہ کہا جاتا ہے۔ اور مثلاً جبریل و عیسیٰ علیہما السلام کو روح اللہ کہا جاتا ہے۔ حالانکہ تمام ارواح اللہ تعالیٰ ہی کی ہیں اور وہی سب کا مالک ہے۔ اور اسی طرح حضرت صالح علیہ السلام کی ناقہ (اونٹنی) کو ناقہ اللہ کہا جاتا ہے حالانکہ جتنی بھی اونٹنیاں ہیں سب اللہ تعالیٰ کی ہی ہیں۔ بس اسی طرح آدم علیہ السلام کی صورت کو بھی۔ صورة اللہ وصورة الرحمٰن۔ کہہ دیا گیا ہے۔ حالانکہ تمام صورتیں اللہ تعالیٰ ہی کی ملک اور اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں۔

ساق و کشف ساق اور اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث بھی ثابت ہے کہ یوم القیامۃ ان اللہ عزوجل یکشف عن ساق فیخرون سجدا۔ (قیامت کے روز اللہ تعالیٰ سب آشکارا کر دیگا، تو لوگ سجدہ میں گر پڑیں گے۔) اگرچہ لغت میں لفظ ساق بمعنی پنڈلی آتا ہے، لیکن کسی معاملہ کی شدت کا اظہار کرنے کے لئے کشف ساق (یعنی پنڈلی کھولنے) سے استعارہ کیا جاتا ہے، کیونکہ انسان جب کوئی کام نہایت جدوجہد سے انجام دینا چاہتا ہے تو اپنے پائینچے چڑھا لیتا ہے، جس سے اس کی پنڈلیاں کھل جاتی ہیں۔ زبان عرب میں کمال بلاغت کی وجہ سے اس قسم کے محاورات بکثرت رائج ہیں۔ مثلاً وہ عریض القفا۔ (چوڑی گدّی والا) کہہ کر اس سے احمق مراد لیتے ہیں۔ اور کثیر الرماد (بہت سی راکھ والا) کہہ کر اس سے سخی مراد لیتے ہیں۔ کیونکہ جسکی گدی چوڑی ہوگی۔ اس کا سر بھی اسی حساب سے بڑا ہوگا اور اس میں رطوبات بلغمیہ بھی زیادہ ہوں گی جسکی وجہ سے اس کی عقل کم ہوگی اب اگر کوئی چھوٹے سر والا بھی احمق ہو تو اُسے بھی۔ عریض القفا۔ ہی کہیں گے۔ اسی طرح جس کے یہاں راکھ بہت ہوگی تو آگ بھی بہت ہو گی اور جب آگ بہت ہوئی تو کھانا بھی بہت پکے گا۔ اور جب کھانا پکے گا۔ تو کھانے والے بھی بہت ہوں گے۔ اور جو بہتوں کو کھانا کھلائے گا، وہ سخی ہوگا۔ اس لئے وہ کثیر الرماد (بہت راکھ والا) کہہ کر سخی

مراد لیتے ہیں۔ اگرچہ کسی سخی کے یہاں ذراسی بھی راکھ نہ ملے۔ اسی طرح کشفِ ساق۔ بھی انتہائی جد وجہد کے ساتھ مکمل کام کرنیکے لئے استعمال ہوتا ہے۔ خواہ وہ کام کسی ایسے کی طرف منسوب ہو جسکی پنڈلی ہی نہ ہوتی ہو۔ چنانچہ اسی حدیث بالا کی طرح قرآن مجید میں بھی یہ محاورہ استعمال ہوا ہے۔ اور معاذ اللہ یہ ہرگز مراد نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ساق یا پنڈلی ہے جسکی قیامت میں زیارت کرائی جائے گی۔ چنانچہ ارشاد ہے: یوم یکشف عن ساق ویدعون الی السجود۔ (جس روز پنڈلی کھولدی جائے گی۔) یعنی قیامت کے ہولناک مناظر آشکارا کردیئے جائیں گے اور کارکنانِ قضاء و قدر اپنے فرائض میں نہایت جد وجہد اور تندہی کے ساتھ مشغول ہوں گے۔) اور لوگوں کو سجدہ کی دعوت دی جائے گی۔ چنانچہ اس آیت میں محشر کی شدت کا اظہار کیا گیا ہے۔ کیونکہ عرب ایسے موقع پر کہتے ہیں۔ شمرت الحرب عن ساقہا۔ (جنگ نے شدت اختیار کرلی) اور اگر اس کا لفظی ترجمہ کیا جائے تو یہ ہوگا کہ "جنگ نے اپنی پنڈلی سے پائینچہ چڑھالیا۔" مگر یہ بالکل غلط ہوگا کیونکہ جنگ کوئی انسان نہیں جسکی پنڈلی ہو اور وہ پاجامہ پہنے ہو اور اس کا پائینچہ چڑھائے۔ چنانچہ جریر کہتا ہے ؎

الا رب سامی الطرف من آل مازن اذا شمرت عن ساقہا الحرب شمرا

دیکھو تو آل مازن کے صاحب نخوت لوگوں کا طریقہ یہ ہے کہ جب جنگ اپنی پنڈلی سے پائینچہ چڑھالیتی ہے۔ یعنی شدید ہوتی ہے تو وہ بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نہ جنگ کا جسم ہے نہ پنڈلی نہ پاجامہ نہ پائینچہ۔ مگر جب "کشفِ ساق" "شدتِ امر کے لئے مستعمل ہونے لگا۔ تو پھر اس میں اس کا لحاظ بھی نہ رہا کہ جسے اس کا فاعل بنایا جا رہا ہے، درحقیقت وہ صاحب ساق۔ (پنڈلی والا) ہونے کا اہل بھی ہے یا نہیں۔ اسی طرح لغتِ عرب کے کثیر محاورات ایسے ہیں کہ اگر ان کا لفظی ترجمہ کردیا جائے تو ایک اچھا خاصا فصیح و بلیغ کلام بالکل ہذیان معلوم ہوگا۔ اس لئے جہاں کہیں بھی ظاہری الفاظ کا مطلب عقل یا بداہت کے خلاف ہو، وہاں علم محاورات کی طرف رجوع کرنا واجب ہے ورنہ اس کلام کا مطلب ہی غلط ہوجائے گا۔ (اور اسی خرابی سے بچنے کیلئے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد ہے کہ قرآن مجید کا صحیح مطلب سمجھنے کیلئے شعرائے جاہلیت کا کلام دیکھو) مثلاً عربی میں ایک محاورہ ہے: سقط فی یدہ۔ جس کے الفاظ کا لفظی ترجمہ تو یہ ہے کہ (اس کے ہاتھ میں گرا دیا گیا۔) مگر یہ جملہ کلام عرب میں کہیں بھی اس معنی میں مستعمل نہ ملے گا بلکہ اس کے معنی ان کے محاورات میں ہمیشہ یہ ہوتے ہیں کہ (وہ نادم ہوا یا متحیر ہوگیا۔ وغیرہ) چنانچہ یہی محاورہ اسی معنی میں قرآن مجید میں بھی مستعمل ہوا ہے: فلما سقط فی ایدیہم۔ (اور جب بنی اسرائیل نادم ہوئے۔)

اسی طرح اگر یوم یکشف عن ساق سے (جس کا لفظی ترجمہ تو یہ ہے کہ جس دن پنڈلی کھول دی جائے گی۔) ساق کی تجلی مراد ہوتی تو یہاں بمقتضائے بلاغت بجائے ساق، وجہ زیادہ مناسب ہوتا کیونکہ دیدار و تجلی تو چہرہ کی ہوتی ہے نہ کہ پنڈلی کی۔ بلکہ کسی کو پنڈلی دکھانا ہمارے یہاں عیب اور خلاف تہذیب سمجھا جاتا ہے کہ بادشاہ اپنے دربار میں شرف باریابی کے وقت لوگوں کو پیر یا پنڈلی دکھائے اس لئے یہ اچھی طرح ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف اعضائے جسمانی کی اضافت محض افہام و محاورۂ عرب کے مطابق کی گئی ہے نہ کہ حقیقت کے طور پر۔ (اس کے علاوہ اگر یہاں درحقیقت تجلی ساق ہی مراد ہوتی تو "ساق" معرف باللام ہونا چاہئے یعنی "الساق" اور اس موقع پر اس کا نکرہ لانا قواعد عربیت کے خلاف ہے۔) واللہ اعلم۔
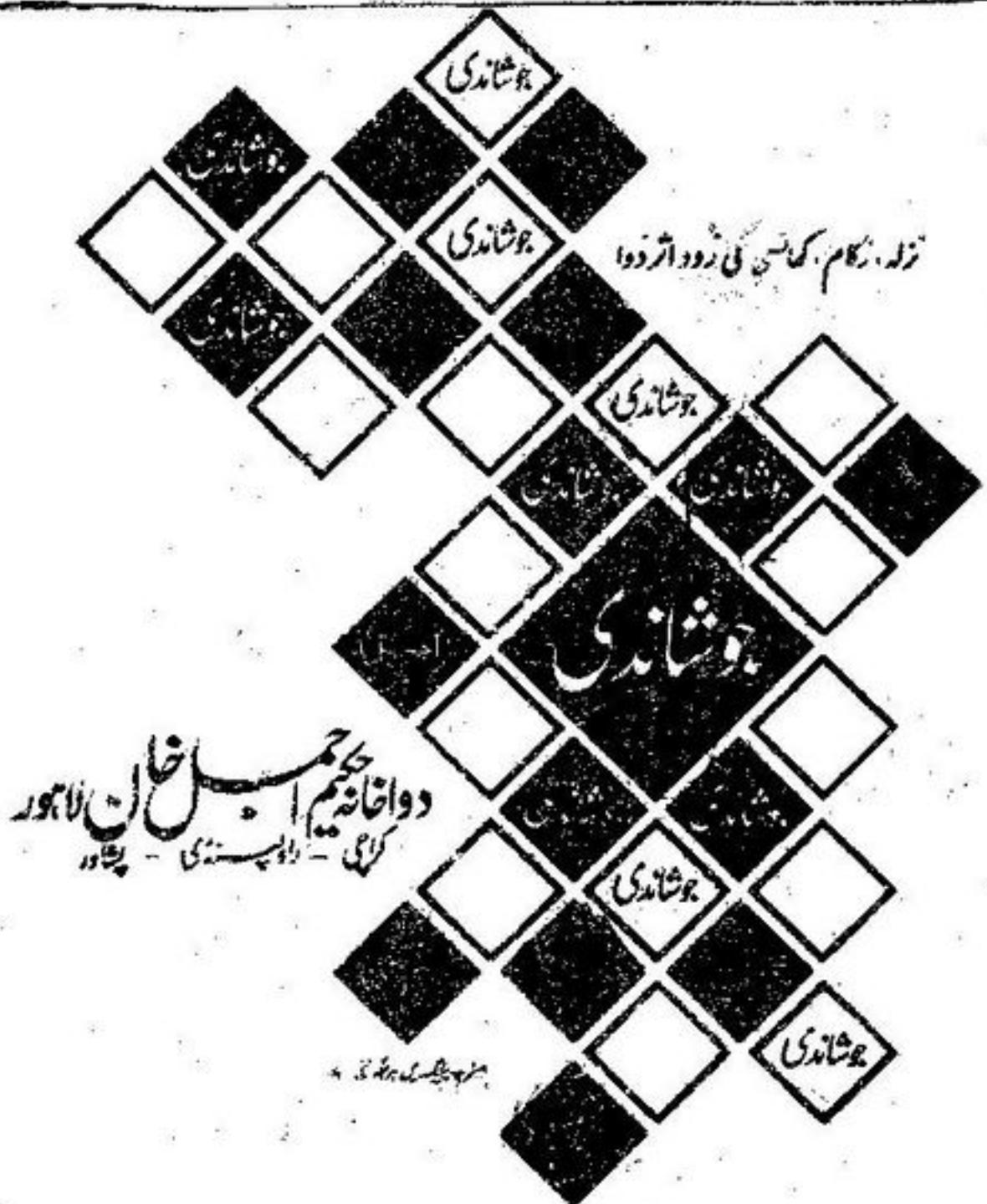
جمہوریت کیا ہے؟

منظر عباسی (مری)

یہ زمانہ نشر و اشاعت، تشہیر اور پروپیگنڈے کا ہے۔ اخبارات، رسائل، ریڈیو اور ٹیلی ویژن وغیرہ ذرائع ابلاغ و تشہیر ہیں۔ اور پروپیگنڈا ایک فن اور سائینس کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اس فن کے ماہر چاہیں تو نیک کو بد اور بد کو نیک منوا سکتے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا اصول اور طریق کار یہ ہے کہ جو بات مشہور اور مقبول بنانی ہو اسے بار بار دھرایا جائے، تاکہ لوگ اسکی صداقت پر یقین کر لیں۔

گذشتہ ایک سو سال سے جمہوریت کے حق میں پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے اور عوام کو اسی حد تک متاثر کر دیا گیا ہے کہ جمہوریت کے نادیدہ عاشق بن گئے ہیں۔ جمہوریت نے مذہب کا مقام اختیار کر لیا ہے۔ اور مفاد پرست جمہوریت کے نام پر عوام کو دھوکا دینے میں پوری طرح کامیاب ہیں۔ امریکہ جمہوریت کے نام پر ویت نام میں جو کچھ کر رہا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔

ہمارے ہاں بھی جمہوریت کا چرچا عام ہے اور لوگوں کو جمہوریت کے نام پر آسانی سے متاثر کیا جا سکتا ہے۔ اور تو نوبت یہاں تک آن پہنچی ہے کہ لوگ اور اچھے خاصے دیندار لوگ بھی اسلام کے بعض اصولوں کو جمہوریت کے پیمانے سے ناپ رہے ہیں۔ ان حالات میں ضروری ہے کہ ہم جمہوریت کی حقیقت سے باخبر ہوں۔ بس اسی مقصد کیلئے یہ سطور پیش کی جا رہی ہیں۔

اھدنا الصراط المستقیم۔

جمہوریت: جمہوریت عربی زبان کا لفظ ہے۔ جو لفظ "جمہور" کے آخر "یت" لاحقہ لگا کر بنایا گیا ہے۔ جمہور کے معنی ہیں عوام، اکثریت، لوگ وغیرہ انگریزی میں جمہوریت کا مترادف ڈیموکریسی (DEMOCRACY) ہے۔ یہ لفظ لاطینی زبان کے دو لفظوں سے مرکب ہے ڈیمو (DEMO)

یعنی عوام۔ اور کراتو (KRATU) یعنی طاقت۔ مرکب کے معنی ہیں عوام کی طاقت، عوام کی حکومت، یا عوام کا اقتدار۔ ایک دوسرا لفظ ہے ری پبلک (REPUBLIC) یہ REAL اور PUBLIC سے مرکب ہے، جس کے معنی ہیں حقیقی عوام۔ غرض جمہوریت اور اس کے مترادفات کے معنوں میں عوام یا اکثریت کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

یہ تو لفظ جمہوریت کا لغوی معنیٰ تھا جس سے بحث ہمارا مقصد نہیں۔ ہم اس کے اس مفہوم پر غور کرنا چاہتے ہیں۔ جو علم سیاست کی اصطلاح میں مراد لیا جاتا ہے۔ علم سیاست میں جمہوریت سے مراد ایک خاص طرزِ حکومت (A FORM OF GOVERNMENT) ہے، جس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ اس حکومت کے چلانے والے عوام ہوتے ہیں اور عوام اپنے ہی مفادات اور فوائد کے لئے حکومت چلاتے ہیں۔ امریکہ کے ایک مقتول صدر ابراہیم لنکن کا کہنا ہے کہ:

Democracy is the Government of the people, by the people, For the people.

یعنی جمہوریت: ایک عوامی حکومت ہے، جسے عوام اپنے لئے خود چلاتے ہیں۔

جمہوریت کی تاریخ خاصی پرانی اور طویل ہے۔ اڑھائی ہزار سال قبل مسیح یونان کے حکما نے جمہوریت پر غور و فکر کیا تھا۔ یونانی فلاسفر افلاطون (PLATO) کی کتاب "جمہوریت" (REPUBLIC) آج بھی دنیا میں شوق سے پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے۔ جدید جمہوریت کے داعی وہ لوگ ہیں جن کی کوششوں سے اٹھارویں میں انقلاب فرانس رونما ہوا۔ روسو کی کتاب "معاہدۂ عمرانی" (CONTRAT SOCIAL) انقلاب فرانس کے مجاہدوں کے نزدیک انجیل کا درجہ رکھتی تھی۔ اس کتاب میں جمہوریت کو بہترین حکومت ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

جمہوریت چونکہ ایک طرز حکومت ہے، اس لئے اس کی حقیقت کو بے نقاب دیکھنے کیلئے ضروری ہے کہ ہم حکومت کی حقیقت کو سامنے رکھیں نیز حکومت مملکت یا ریاست (STATE) کا ایک حصّہ ہے، اس لئے مملکت کی اصلیت سے بھی واقف ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا ہمیں بات مملکت سے شروع کرنی چاہیئے۔

<u>مملکت</u>: مملکت یا ریاست جسے انگریزی میں سٹیٹ (STATE) کہتے ہیں، ایک سیاسی اصطلاح ہے۔ اور اس سے مراد ایک ایسا خطۂ ارضی ہے، جس پر مخصوص لوگ آباد ہوں اور ان لوگوں کی منظم معاشرت اور ان کا اپنا اقتدار ہو۔ منظم معاشرت سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ قواعد و ضوابط کے

پابند ہوں اور ملکر اس انداز میں زندگی بسر کرتے ہوں کہ ہر ایک کے فرائض اور حقوق متعین ہوں، اقتدار سے مراد یہ ہے کہ اسی خطۂ ارضی پر بسنے والوں کی اپنی خود مختار حکومت ہو۔ ان کی اجازت کے بغیر اس سرزمین میں کوئی شخص داخل نہ ہو سکے، اور انہیں دنیا کی دوسری مملکتوں یا ریاستوں سے صلح و جنگ کے معاہدے اور معاملات کرنے کی آزادی ہو۔ مملکت میں مستقل آباد لوگ، اسی مملکت کے شہری کہلاتے ہیں۔ اور ان کے آپس کے تعلقات جو ایک مملکت کے شہری ہونے کی حیثیت سے قائم ہوتے ہیں، ان میں قومیت کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ اس طرح ایک مملکت کے تمام شہری ایک قوم کہلاتے ہیں، اور مملکت ان کا وطن ہوتی ہے۔

گویا وطن اور قوم کا تصور مملکت کے وجود سے قائم ہے۔ اس موقعہ پر یہ بات ذہن نشین رہے کہ ہم مملکت قوم وطن یا حکومت کے اسلامی تصور کی بات نہیں کر رہے ہم جو کچھ عرض کر رہے ہیں وہ جدید علم سیاست کی جدید اصطلاحات کی تشریح ہے۔

مملکت کس طرح وجود میں آئی فرانس کے عظیم دانشور جس کی کتاب معاہدہ عمرانی کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ یعنی روسو اپنی ایک دوسری کتاب "انسانی عدم مساوات کے اسباب" میں لکھتا ہے کہ،

"موجودہ معاشرے کا بانی وہ شخص ہے، جس نے پہلے پہل زمین کے قطعہ پر قبضہ کر کے یہ کہا کہ یہ میری ملک ہے۔"

گویا مملکت کا وجود اس وقت ظہور پذیر ہوا جس وقت انسان میں ذاتی ملکیت اور خاص کر زمین پر قبضہ کا تصور پیدا ہوا۔ پہلے پہل انسان خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرتا تھا، شکار کرتا اور بھوک کی آگ بجھاتا رفتہ رفتہ زندہ شکار پکڑنے کے قابل ہوا، اور اس سے مویشیوں کے ریوڑوں کا مالک بن گیا۔ مویشیوں کے لئے چراگاہوں کی ضرورت تھی، مختلف گروہوں اور قبیلوں میں بٹے ہوئے انسانوں نے برف پہاڑوں، ریگستانوں اور خطرناک جنگلوں سے بچی ہوئی زمین کو چراگاہوں میں بانٹ لیا تھا۔ رفتہ رفتہ انسان نے کاشت اور زراعت کا مشغلہ اختیار کیا۔ تو زمین کی اہمیت بڑھ گئی، مستقل آبادیاں اور شہر وجود میں آگئے، اور شہری زندگی نے ثقافت اور تہذیب کو جنم دیا، تقسیم کار کا اصول رائج ہوا اور مملکت نے موجودہ صورت اختیار کر لی۔

آج مملکت ایک وطن ہے، اور مملکت میں تمام لوگ ایک قوم ہیں۔ اس قوم کا فرض ہے کہ اپنے وطن کے اندر امن اور اس کی سرحدوں کے تقدس کی حفاظت کرے۔ داخلی امن کے لئے قانون، عدالت، پولیس اور عقوبت خانوں کا ہونا ضروری ہے اور سرحدوں کی حفاظت کے لئے مسلح افواج

لابدی ہیں۔ آج دنیا میں کسی ایسی مملکت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا جو قانون، عدالت، پولیس، عقوبت خانوں اور مسلح افواج کی ضرورت محسوس نہ کرتی ہو، سوئٹزرلینڈ میں اگر مسلح فوج نہیں تو اس کی فوجی ضرورت اس کے ہمسایہ ملک باہمی معاہدہ کی رو سے پوری کرتے ہیں۔ مملکت کی ان ضرورتوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ملک میں ایک ادارہ قائم کیا جاتا ہے جسے حکومت کہتے ہیں ——

روسو نے اپنی کتاب "معاہدہ عمرانی" میں وضاحت سے بتایا ہے کہ مملکت اور حکومت کا وجود اس وقت ممکن ہوا جب انسان کے پاس اس کی ضرورت سے زیادہ دولت جمع ہوئی۔ اس لئے کہ اگر زائد دولت نہ ہو تو مملکت اور حکومت کے اخراجات پورے نہیں ہو سکتے۔ اشتراکیوں کا خیال ہے، جیسا کہ لینن نے اپنی کتاب "ریاست و انقلاب" میں لکھا ہے کہ

"ریاست یا مملکت سماج میں طبقات کا نتیجہ ہے، یہ ناقابل مصالحت طبقاتی تضادات کا نتیجہ ہے اور مظلوم کو لوٹنے اور دبائے رکھنے کا ایک ذریعہ ہے۔"

لینن اپنی محولہ بالا کتاب میں وضاحت سے لکھتا ہے کہ ریاست طبقات کی پیداوار ہے، اور جب طبقات ختم ہو جائیں گے اور دنیا میں صرف اور صرف محنت کشوں کا راج ہوگا۔ اس وقت مملکت یا ریاست خود بخود ختم ہو جائے گی۔

ریاست اور حکومت کی حیثیت کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ہم قارئین کرام سے عرض کریں گے کہ اگر موقع ملے تو روسو کی کتاب "معاہدہ عمرانی" اور لینن کی کتاب "ریاست و انقلاب" کا ضرور مطالعہ کریں۔ یہ کتابیں فکر انسانی کی ان خامیوں کی نشاندہی کرتی ہیں جو وحی کی روشنی سے محرومی کے نتیجہ میں پیدا ہوئی ہیں۔

روسو کی کتاب "انسانی عدم مساوات کے اسباب" سے ایک اقتباس ہم نے اوپر پیش کیا ہے۔ اس کے بعد وہ ذرا آگے چل کر لکھتا ہے:

"کتنے جرائم جنگوں قتل و غارت گری مصائب اور آلام سے بنی نوع انسان کو نجات مل جاتی اگر کوئی شخص حد بندی کے نشانوں کو مٹا دیتا اور لوگوں سے مخاطب ہو کر کہتا کہ تم سب زمین کے ایک جیسے مالک ہو اور یہ شخص جو اپنے لئے یا اپنی قوم کے لئے زمین کا حصہ مخصوص کر رہا ہے، یہ دھوکہ باز اور فریب کار ہے۔"

گویا روسو کے نزدیک مملکت کا وجود دنیا میں فتنہ و فساد قتل و غارت گری اور جنگوں کا باعث ہے۔

آپ دیکھ چکے ہیں کہ مملکت نے وطن اور قوم کا تصوّر ابھارا ہے، اور دنیا میں جس قدر بڑی لڑائیاں ہوئی ہیں، وہ وطن پرستی اور قوم پرستی ہی کے نتائج ہیں۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد ایک مغربی دانشور نے "عالمی ریاست" (THE STATE OF THE WORLD) کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں جنگ کے اسباب وعلل کا تجزیہ کیا ہے۔ اور لکھا ہے:

"یہ واقعہ ہے کہ ہمارے دور کی دونوں لڑائیاں قوم پرستی کی پیداوار ہیں۔ اور یہی (قوم پرستی) ہمارے زمانے میں سب سے بڑی سیاسی قوت ہے ان دونوں لڑائیوں کی تہ میں وہی اصول کارفرما تھا جس کی رو سے دنیا کو آزاد قومی مملکتوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اور جس کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ مختلف مملکتیں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی فکر کرتی ہیں۔ اور اس طرح ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں۔ ان حالات میں کبھی صالح معاشرتی نظام قائم ہی نہیں ہو سکتا۔ اور رونا صرف یہی نہیں کہ دو عالمگیر لڑائیاں کیوں ہوگئیں بلکہ رونا اس بات کا ہے کہ جب دنیا میں جنگ نہیں ہو رہی ہوتی اس وقت بھی امن قائم نہیں ہوتا۔"

(بحوالہ کتاب "انسان نے کیا سوچا" صفحہ ۲۳۹)

مصنّف نے واضح اور کھلے لفظوں میں دنیا بھر کے سیاست دانوں کی فکری کوششوں کے غلط نتائج اور بدترین ثمرات کی نشاندہی کی ہے۔ جس سے یہ حقیقت نمایاں ہوگئی ہے۔ کہ مملکت کا وجود جنگ و جدل اور فتنہ و فساد کا باعث ہے۔ ظاہری جنگ نہ ہو تو بھی دنیا میں امن قائم نہیں رہتا مملکتوں کے درمیان سیاسی اختلافات جنہیں سرد جنگ کہا جاتا ہے۔ ہر وقت موجود رہتے ہیں۔

امن نام ہے ذہنی سکون کا اور ایسے حالات کا جن میں انسان اطمینان سے زندگی بسر کرے اور سب جانتے ہیں کہ یہ چیز آج بھی اسی طرح ناپید ہے جس طرح ۱۹۱۴ء کی پہلی عالمی جنگ اور ۱۹۳۹ء کی دوسری عالمی جنگ کے زمانوں میں ناپید تھی۔ جنگ، اور نام نہاد امن کے زمانوں میں اگر فرق ہے تو صرف اتنا ہے کہ جنگ کے زمانے میں فتنہ و فساد زیادہ شدید ہوتا ہے اور مؤخر الذکر زمانے میں اس کی شدّت میں کسی حد تک کمی آجاتی ہے۔ یا جنگ کے زمانے میں انسانوں کا قتل ہوتا ہے اور امن کے زمانے میں قتل کئے جانے کا ڈر اور خوف ہوتا ہے۔ نیز امن کے زمانے میں جنگ کی تیاری کی جاتی ہے۔

مملکت کے حامیوں کا دعویٰ ہے کہ ہم نے زمین کو مختلف اقوام میں منصفانہ طور پر تقسیم کر دیا

ہے تاکہ امن قائم رہے، لیکن حالات و واقعات شاہد ہیں کہ اس تقسیم نے اقوام میں نفرت اور علیحدگی کے رجحانات پیدا کر دئیے ہیں۔ افراد کا بغض، دعداوت، حسد اور رقابت قوموں کے بغض، عداوت حسد اور رقابت میں بدل گئے ہیں۔ جب مملکت نہ تھی تو زید بکر کا مخالف تھا زید بکر سے حسد کرتا اور مال و دولت میں اس سے بڑھ جانے کی فکر میں رہتا تھا۔ اب جبکہ مملکت قائم ہو گئی ہے، تو زید کی پوری قوم بکر کی پوری قوم سے حسد کرنے لگی اور مال و دولت میں اس سے آگے نکل جانے کی فکر میں ہے۔ گویا افراد کی برائیاں قوموں کی برائیاں بن گئی ہیں، افراد کے اختلاف قوموں کے اختلافات کی صورت میں بدل گئے ہیں۔ یوں کہئے کہ اختلافات کو مملکت نے منظم اور مستحکم کر دیا ہے۔

آج جب کہ جنگ کی حالت نہیں ہے۔ دنیا کے ساڑھے تین ارب انسان اپنی محنت و مشقت کے ثمرات یعنی دولت کا نوے فی صد جنگ کی تیاری پر صرف کر رہے ہیں۔ انسان چاند پر اس لئے نہیں گیا کہ خدا کی خالقیت کے مظاہر کا مشاہدہ کرے یا خلق خدا کی بہتری کی راہیں نکالے بلکہ اس نیت اور ارادے سے گیا ہے، کہ تیسری عالمی جنگ کی صورت میں خلا سے آگ برسانے کا بندوبست کرے روسی اور امریکی سیاست دانوں نے تسلیم کر لیا ہے کہ تسخیر خلا سے ان کا مقصد جنگ کی تیاری ہے۔ یہ ہے مملکت۔ اب آئیے حکومت کی طرف جو مملکت کے مقاصد کو عملی صورت دینے کا ایک ذریعہ یا مملکت کا ایک ذیلی ادارہ ہے۔

حکومت | حکومت ایک ایسا ادارہ ہے، جو مملکت کے مقاصد کی تکمیل کے لئے قائم کیا جاتا ہے۔ حکومت مملکت کے اندر امن اور اس کی سرحدوں کے تقدس کی حفاظت کرتی ہے۔ حکومت قوم کے افراد یعنی مملکت کے شہریوں کو ان کے فرائض ادا کرنے پر مجبور کرتی اور ان کے حقوق کی حفاظت کرتی ہے۔ قانون، عدالتیں، پولیس، عقوبت خانے اور مسلح افواج حکومت کے کارنامے ہیں۔ اور انہی کے ذریعہ حکومت مملکت کے مقاصد کی تکمیل کا کام کرتی ہے۔

حکومت کی مختلف قسمیں ہیں، لیکن سب میں قدر مشترک حاکمیت کا تصور ہے۔ مملکت میں آباد شہریوں کی غالب اکثریت بلکہ کم و بیش ساری قوم محکوم اور رعایا ہوتی ہے۔ اور چند افراد حاکمیت اور اقتدار کے مالک ہوتے ہیں۔ گویا قوم دو حصوں یا دو طبقوں میں بٹ جاتی ہے۔ حاکم اور محکوم حاکم طبقہ اپنی حاکمیت کے تحفظ اور بقاء کے لئے جد و جہد کرتا ہے، اور محکوم طبقہ زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل کرنے کی کوششوں میں مصروف رہتا ہے۔ حاکم خواہ بادشاہ ہو یا صدر مملکت اس کا مفاد محکوم عوام کے مفادات سے مختلف ہوتا ہے۔ سربراہ مملکت کو اپنے مفادات کے

تحفظ کے لئے مکر و فریب سے کام لینا پڑتا ہے۔ کہیں ایسا ہوتا ہے کہ حاکم محکوم رعایا میں پھوٹ ڈال کر انہیں کمزور بنائے رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور کہیں قوم اور وطن پرستی کے جذبات ابھار کر بیرونی دشمنوں کی فرضی دشمنی کا مقابلہ کرنے کی راہیں سوچتا ہے۔ جنگ ہمیشہ دو مملکتوں کے حکمرانوں کی غلط حکمت عملی کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے اور اس کا سارا بوجھ محکوم عوام کو برداشت کرنا پڑتا ہے بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی ملک کا حکمران محکوم رعایا کی توجہ ملکی مسائل سے ہٹانے کی خاطر جنگ چھیڑ دیتا ہے۔ اور اس کے تمام تر نتائج کی ذمہ داری قوم پر ڈال دی جاتی ہے۔

حکمرانوں نے اپنے اعمال کی ذمہ داری محکوم عوام پر ڈالنے کے لئے حکومت کی ایک نئی قسم اختراع کی ہے جسے جمہوریت کا نام دیا گیا ہے۔ لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ اس حکومت کے تمام فیصلے عوام کی مرضی کے مطابق ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان فیصلوں کی ذمہ داری بھی عوام ہی پر عائد ہوتی ہے۔ تاریخ میں بیشمار ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ کسی ملک کے بادشاہ نے جنگ وغیرہ قسم کی کوئی بڑی ذمہ داری اپنے ذمہ لی اور جب اس میں وہ ناکام ہوا تو اسے سزا دی گئی۔ اور عوام نے اسے قتل کر دیا۔ عہدِ حاضر کے حکمرانوں نے اس خطرے سے بچنے کے لئے جمہوریت کی راہ نکالی ہے، کہا جاتا ہے کہ:

"جمہوریت میں اقتدار کے مالک عوام ہوتے ہیں۔ ہر چھوٹا بڑا فیصلہ عوام کرتے ہیں اور نتائج کی ذمہ داری بھی عوام ہی برداشت کرتے ہیں۔"

اہل نظر سے پوشیدہ نہیں کہ حکمرانوں کا یہ کہنا کہ عوام اقتدار کے مالک ہوتے ہیں، سراسر جھوٹ ہے، اگر عوام اقتدار کے مالک ہیں، تو اقتدار کن لوگوں پر قائم کیا جاتا ہے۔ کیا کوئی شخص بیک وقت حاکم اور محکوم ہو سکتا ہے۔؟ حکومت شخصی ہو یا جمہوری اقتدار کے مالک صرف چند افراد ہوتے ہیں اور باقی عوام محکوم رعایا کے سوا کوئی حیثیت نہیں رکھتے، البتہ حکمرانوں کے اعمال بد کی ذمہ داری ان سب پر عائد ہوتی ہے۔ یہ رات دن کماتے اور محنت کرتے ہیں۔ اور ان کے ٹیکسوں سے حکمران طبقہ حکومت کے مصارف پورے کرتا ہے۔ یہ لوگ حکمرانوں کے مفادات میں فوجوں میں شامل ہو کر سرحدوں پر اور سرحدوں سے اور دوسری مملکت کی حدود میں جا کر لڑتے اور اپنا خون بہاتے ہیں۔ دنیا کی پوری تاریخ میں کوئی ایک ایسی مثال نہیں ملتی جس میں کسی مملکت کے محکوم عوام یعنی رعایا پر مشتمل فوج نے کسی ایسے ملک یا مملکت کی افواج سے جنگ کی ہو جس سے لڑنے والوں کی مخالفت یا دشمنی بھی۔ جنگ ہمیشہ حکمرانوں کی غلط کاریوں کا نتیجہ ہوتی ہے، اور سپاہی بیچارے دھوکے میں ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ روسو نے لکھا ہے:

"جنگ انسانوں کے تعلق نہیں بلکہ ریاستوں کے آپس کے تعلقات کا نام

باقی صفحہ ۵۴ پر

ایک بقیۃ السلف عالم دین علامہ مولانا مارتونگ صاحب مدظلہ کی کہانی انکی اپنی زبانی

راوی :- صاحب سوانح مدظلہ
روایت :- مولانا فضل مولیٰ صاحب مدرس دارالعلوم حقانیہ
ترجمہ :- ادارۂ الحق

سنڈاکی بابا سے بیعت | سابقہ تعارف کی بناء پر میں حضرت سنڈاکی باباجی مرحوم کا شرف ملاقات حاصل کرنے علاقہ سوات کے موضع شامیزو روانہ ہوا، اور حضرت کی خدمت میں بیعت کی درخواست پیش کی حضرت مرحوم کا قاعدہ تھا کہ بیعت سے ان افراد کو نوازتے تھے، جن میں صداقت خلوص اور تکمیل شوق کا جذبہ ہوتا لیکن میری درخواست بیعت پر کسی قسم کا پس و پیش نہ کیا۔ اسی رات میں نے نماز استخارہ پڑھی، اور سوگیا۔ خواب میں جو کچھ نظر آیا وہ صبح کے وقت میں نے حضرت کو حرف بحرف بیان کیا۔ میری روئیداد کو سنکر حضرت نہایت خوش ہوئے۔ اور مجھے اس مسجد سے جہاں بہت ہجوم رہتا اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ چلتے چلتے ہم گاؤں کی ایک پرانی ویران سی مسجد میں پہنچ گئے اور یہیں پر حضرت نے مجھے بھی وضو کرنے کا حکم دیا اور خود بھی وضو کیا اور مسجد کے ایک تاریک کمرے میں، مجھے بیعت سے نوازا۔ خصوصی ہدایات دیں اور کتاب اللہ پر عمل کی ترغیب کی۔ ان کاموں سے فارغ ہو کر حضرت نے مجھ سے خصوصی مصافحہ فرمایا اور کہا کہ بیعت کا اس قسم کا مصافحہ سلسلہ وار چلا آرہا ہے۔ اور یہ بالواسطہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور بیعت رسولؐ درحقیقت بیعت خدا ہے۔ ید اللہ فوق ایدیھم۔ اور آج کے بعد تم پر لازم ہے کہ رب کے قوانین کی حدود کے اندر رہیں۔ اور ہر قسم کی نفسانی اور حیوانی خواہشات کو قابو میں رکھیں۔ اس کے بعد میں ہر چار یا پانچ سال کے بعد حضرت کا شرف ملاقات حاصل کرنے کے لئے خدمت اقدس میں حاضری دیا کرتا تھا۔ اس دوران میں نے اپنے اسباق سلسلہ قادریہ کی

تکمیل بھی کی۔ حضرت نے چونکہ مجھے خلافت سے نہیں نوازا تھا۔ اور نیز چند مقامی وجوہات کی بناء پر وہ دیر چلے گئے تھے اور وہاں موضع کوہاں شریف میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس لئے ان کی وفات تک زیارت کا موقع نصیب نہ ہو سکا۔ ان کا مزار شریف یہیں ہے۔

جذبۂ تبلیغ کی شدت | حضرتؒ کی وفات کے چند سالوں بعد دل میں جذبۂ تبلیغ ابھر آیا، اور چند باعمل اور صالح علماء کو اپنے ساتھ لیکر گاؤں گاؤں پھرے اور تبلیغ اسلام کرتے رہے۔ ہمارا مقصد صرف اور صرف احکام شرعی کا نفاذ تھا۔ میری ان کوششوں کا نتیجہ بہت جلد سامنے آیا اور علاقہ مار تونگ چکیسر اور علاقہ اباسین چیغرزائی میں ہمیں بے حد کامیابی حاصل ہوئی۔ میری ان مخلصانہ جدوجہد اور شوق سے متاثر ہو کر میری قوم نے مجھ سے بیعت کے مطالبے شروع کئے، لیکن چونکہ میں بیعت کا مجاز نہیں تھا، اس لئے میں نے کوئی ایسا کام نہیں کرنا تھا جسکا مجھے حکم نہیں ملا تھا۔ لیکن میرے جو وظائف اور اذکار لوگوں نے سنے تھے انہوں نے از خود انہیں ورد میں شامل کر لیا، اور قدرتِ الٰہی یہ کہ وہ بہت جلد اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے۔ بعد ازاں میں علاقہ تیراہ میں پڑوان شریف گیا۔ وہاں حضرت شیخ المشائخ سید عبدالرازقؒ سے ملاقات ہوئی۔ (موصوف نقشبندیہ قادریہ اور چشتیہ سلسلوں میں خلیفہ تھے۔) اسی دوران ہم احکام شرعی کی تبلیغ کرتے رہے۔ اور خصوصاً ادائیگی حج پر ہم نے بہت زور دیا۔ لوگوں کو اس فریضہ کی جانب مائل کرنے کا نہایت اثر ہوا۔

فریضۂ حج | بعض اکابرین چکیسر نے مجھے بھی فریضہ حج ادا کرنے کی پیشکش کی۔ اگرچہ زادِ راہ کچھ بھی نہ تھا۔ لیکن توکل علی اللہ اور وسیلہ انسان کے ذریعے خدا نے مجھے اپنے گھر کی زیارت سے نوازنا تھا سو وہ ہوا۔ ۵ شوال ۱۹۴۸ء کو روانگی ہوئی، راستے میں کچھ عرصے تک بمبئی میں ٹھہرے رہے۔ لیکن جب مکہ معظمہ پہنچ گئے تو ذلیقعدہ کی درمیانی راتیں تھیں، چونکہ ایام حج ابھی دور تھے، اس لئے عمرہ پر اکتفا کرنا پڑا۔ اور زیارت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے شوق میں مدینہ منورہ کیطرف چل پڑے۔

شیخ سنوسیؒ اور مولانا عبدالغفور مہاجر مدنی سے ملاقات | مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں مسجد نبویؐ کے باب السلام میں داخل ہو رہا تھا کہ حضرت مولانا عبدالغفور (عباسی) سے ملاقات ہوئی حضرت مولانا موصوفؒ اس زمانہ میں دہلی کی مسجد سبیل میں امام تھے اور مدرسہ امینیہ میں درس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ انہوں نے مجھے پہچانا۔ اور علمائے ہند سے بھی میرا تعارف کرایا جو وہاں مقیم تھے۔ لہذا آئے دن وہ لوگ ہمیں مدعو کرتے۔ ان دنوں ترکی کے شیخ المشائخ حضرت سنوسیؒ بھی مدینہ منورہ آئے تھے۔ ان کے مریدوں کی تعداد لاکھوں سے بھی زیادہ تھی۔ شیخ مرحوم نے جنگ طرابلس میں حکومت ترکیہ کو

تین لاکھ مرید جنگ کے لئے دئے تھے۔ یہ باتیں مجھے حضرت مولانا عبدالغفور صاحب نے بتائیں نیز یہ بھی بتایا کہ حضرت شیخ ایک محدث عالم بھی ہیں، اور بہت نزدیکی واسطوں سے سلسلۂ سند حضور اکرمؐ تک پہنچتا ہے۔ ان سے ملاقات کا شوق دل میں موجزن ہوا کہ تذکرۂ علمی ہو، ان کی صحبت میں بیٹھ کر عربی میں گفتگو ہو۔ ملاقات کے دوران ان کی علمی قابلیت سے کافی متاثر ہوا، اور ان سے صحاح ستہ کی تدریس کی اجازت کی سند کیلئے عرض کیا۔ انہوں نے اپنے دست مبارک سے دو سند لکھیں جن پر اپنی مہر خاص لگوائی، ایک مجھے دیدی اور ایک مولانا عبدالغفور صاحب کو۔ دس بارہ دنوں کے بعد مکہ معظمہ روانہ ہوئے اور حج بیت اللہ کا فریضہ ادا کیا۔ مکہ معظمہ میں حضرت مولانا عبدالسلام تنوی (ہزارہ) سے ملاقات ہوئی، انہوں نے مجھے بتایا کہ اگر مکہ معظمہ میں تدریس کی خواہش ہے انہیں آگاہ کروں تو وہ اس سلسلے میں میری مدد کر سکتے ہیں۔ لیکن میں نے معذرت کا اظہار کیا۔ اور وطن واپس آیا۔

شیخ سید عبدالرزاق سے خلافت میرے ایک مرید نے حضرت سید عبدالرزاقؒ کو میرے حالات سے آگاہ کیا، تو انہوں نے مجھے ایک تحریری حکمنامہ ارسال فرمایا جس میں انہوں نے مجھے سلسلۂ قادریہ میں خلیفہ مقرر فرمایا تھا، اور مجھے اجازت دی تھی کہ میں لوگوں سے بیعت لوں۔ کچھ عرصہ بعد حضرت عبدالرزاقؒ مزار پیر باباؒ تشریف لے آئے اور پھر مریدوں کے بے حد اصرار پر پورن بھی تشریف لے آئے۔ میں بھی حضرت سے ملاقات کی غرض سے پورن آیا، ملاقات کی اور ان سے گذارش کی کہ مارتونگ کو اپنے قدموں سے مشرف فرماویں۔ میری درخواست پر وہ مارتونگ آئے۔ میں نے طلباء کو چھٹی دی۔ ان دنوں میں نے ترمذی شریف ختم کی تھی اور شمائل ترمذی کو ابھی ابھی شروع کیا تھا۔ حضرت صاحب کو میں نے اسباق کے متعلق بتایا تو انہوں نے مجھے حکم دیا کہ شمائل ترمذی شریف ان کے سامنے طلباء کو پڑھاؤں، اور باقی اسباق کی چھٹی کردوں، طلباء جمع ہوگئے اور درمیان میں حضرت صاحب جلوہ نشین ہوئے، ان کی کرامت کا اثر تھا کہ طلباء پر توجہ سے نہایت اثر ہوا۔ درس کے دوران سب طلبہ پر گریہ طاری ہوا، بیقراری اور اضطراری کیفیت قابل دید تھی کبھی وہ رونے لگتے اور کبھی قہقہے لگاتے، تمام طلباء اور میں خود بھی حضرت کی اس جلالی کیفیت سے بے حد متاثر ہوئے۔ درس کے خاتمہ پر طلباء نے حضرت سے عرض کیا کہ انہوں نے اپنی توجہ مولوی صاحب کی طرف کیوں نہیں کی، تو ارشاد ہوا اگر میں انہیں بھی توجہ دے دیتا تو پھر وہ بھی درس دینے کے قابل نہ رہتے۔ اگلی رات کو حضرت تیراہ صاحب نے مجھے اسباق چشتیہ دئے اور نقشبندیہ، مجددیہ

مصومیہ کے اسباق بھی سمجھائے۔ اور بعد میں کافی ہدایات ونصیحتوں اور محبت سے مجھے ان دو سلسلوں میں بھی اپنا خلیفہ مقرر کیا۔ حضرت کی واپسی کے بعد میں نے بیعت اور تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ اور مجموعی طور پر پچیس سال تک۔ مارتونگ اور دارالعلوم اسلامیہ سیدو شریف میں تدریس کے فرائض انجام دیتا رہا۔ ایک سال تک دارالعلوم مظہر العلوم منگورہ میں افتتاح کے بعد درس دیتا رہا۔ جس کے بانی حضرت حاجی خونہ گل صاحب ہیں۔

مارتونگ میں تدریس کا نظام الاوقات مارتونگ میں تدریس کے پہلے بیس سالوں میں نصاب اور طریقۂ تعلیم یہ تھا کہ شروع میں طلباء کو منطق اور فقہ کی ابتدائی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ فنون ختم کرنے کے بعد ہدایہ دونوں جلدیں شروع کی جاتی تھیں۔ نیز اس دوران نماز فجر کے فوراً بعد تدریس میں مشکوٰۃ شریف بھی پڑھاتا تھا۔ اور مشکوٰۃ شریف ختم کرنے کے بعد جلالین شریف تمام طلباء کو پڑھاتا تھا۔

خواب میں زیارت مارتونگ میں تدریس کے دوران متعدد بار خواب میں زیارت رسول کا شرف حاصل ہوا۔ ایک رات خواب دیکھا کہ میں ایک گاڑی میں سوار ہوں اور میرے ساتھ چند اور علماء بھی ہیں۔ جب ہماری گاڑی ایک جگہ پہنچی تو آواز آئی کہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں، ملاقاتیوں کو اجازت ہے۔ مجھے نہایت تعجب ہوا کہ ان میں سے کوئی بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کیلئے نہیں اترا۔ میں گاڑی سے اترا اور اس جانب روانہ ہوا جہاں سے آواز آئی تھی۔ سامنے دیکھا کہ ایک میدان ہے، جہاں مخلوقات کا مجمع ہے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے لئے آئے ہیں۔ اتنے میں نظر آیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجلس میں داخل ہوئے اور سب سے پہلے مجھ سے مصافحہ فرمایا۔ میں نے حضور اقدس کے جسم مبارک کو دیکھا تو ایک نوجوان نظر آئے۔ اس کے بعد حضور نے اوروں سے بھی اسی طرح سے مصافحہ فرمایا۔ مصافحہ کا انداز ایسا تھا کہ ہر آدمی آگے آتا اور رسول اللہ سے مصافحہ کرنے کے بعد واپس چلا جاتا۔ میں نے ان سے دوبارہ مصافحہ فرمایا۔ جب زائرین مصافحہ سے فارغ ہوئے تو رسول کریم ایک راستے پر روانہ ہوئے، میں بھی پیچھے چل پڑا اور تیسری بار مصافحہ کیا مگر مصافحوں سے مجھے تشفی نہ ہوئی۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ جب ان کے قریب پہنچا تو حضرت مجسم نور نے ناچیز سے معانقہ فرمایا۔ میں نے جب غور سے دیکھا تو ان کی عمر مجھے سن کہولت میں محسوس ہوتی یعنی کافی فرق محسوس ہوا۔ پہلی ملاقات میں نوجوان محسوس ہوتے تھے، اور اب پچاس پچپن برس سے زیادہ کے ۔۔۔ اس خواب کے بعد میں

نے محسوس کیا کہ میرے ذہن میں آلودگی اور گندگی باقی نہیں رہی تھی ۔ اور ذہن میں صفائی پا رہا تھا یہاں تک اسباق پڑھانے کے دوران بلا کاتبۃ دمشقیۃ عجیب عجیب لطائف بیان ہوئے درس کے ساتھ ساتھ میں نے جب تبلیغ کا کام بھی شروع کیا، تو ایک رات خواب میں دیکھا کہ رسول مقبول ہمارے گاؤں کے قریب ایک پہاڑی کے پاس جلوہ افروز ہیں اور ان کے گرد بیشمار لوگ ہیں ۔ میں بھی ان لوگوں میں ہوں ۔ لیکن ان سے آگے اور رسول اللہؐ کے سامنے دو زانوں بیٹھا ہوں ۔ خواب کو دیکھے اگرچہ ایک زمانہ ہو چکا ہے، لیکن میں نے محسوس کیا تھا کہ رسول اللہؐ نے مجھے استارہ میں کچھ فرمایا تھا ۔ اس رات کے بعد میرے جذبۂ تبلیغ میں شدّت پیدا ہو گئی ۔ لیکن ساتھ ساتھ میں تدریس بھی کرتا رہا ۔ اس زمانے میں جب میں نے حسب معمول درس مشکوٰۃ شریف شروع کیا تو شیر افضل خان نامی ایک حکیم جو چکیسر کے رہنے والے تھے ، مشکوٰۃ شریف کے متعلق مارتونگ کے طلباء کے ساتھ بحث وتمحیص کرتے تھے ۔ مشکوٰۃ شریف کے اسرار ورموز سے واقفیت کے شوق نے تجسس کو ابھارا دیا اور ایک دن فیصلہ کیا کہ درس مشکوٰۃ شریف میں ضرور شرکت کریں گے ۔ چنانچہ اسی ارادے کی تکمیل کی خاطر وہ ہماری مسجد میں آپہنچے ۔ لیکن جب طلباء کی زبانی اسے معلوم ہوا کہ درس مشکوٰۃ شریف ختم ہو گیا تو اسے بے حد مایوسی ہوئی ۔ لیکن شوق اور لگن نے اسے نہ چھوڑا اور وہ روزانہ نماز عصر کے وقت چکیسر سے مارتونگ آجاتے اور مجلس میں بیٹھ کر علمی ودینی مسائل سنتے ۔ ایک دن انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں انہیں صحاح ستہ مہیا کروں لیکن میرے پاس چونکہ طلباء دورہ حدیث کو پڑھانے کے لئے صرف یہی کتب تھیں ۔ اس لئے میں نے معذرت کی ۔ اسی دن وہ صاحب حیثیت ومروّت اشخاص کے پیچھے لگ گئے اور انہیں مدرسہ کے لئے کتب خریدنے پر آمادہ کیا ۔ ان لوگوں نے حسب توفیق چندہ کر کے تقریباً ۲۰۰ روپے جمع کئے ۔ اس واقعہ سے چند روز قبل میں نے خواب دیکھا کہ میں ایک جگہ بیٹھا ہوں ۔ اچانک اسی اثناء میں ام المومنین حضرت عائشہ رضؓ کہیں سے نمودار ہوئیں اور میری جانب بڑھنے لگیں ۔ میں تعظیماً کھڑا ہوا اور انہیں بیٹھنے کی گذارش کی وہ میری جگہ آکر بیٹھ گئیں ۔ جب وہ چارپائی پر بیٹھ گئیں تو میری نگاہیں پہلی بار ان کے چہرے مبارکؓ پر پڑیں ، انہوں نے بھی میرا جائزہ لیا ، لیکن مجھے دوبارہ انہیں دیکھنے کی جرأت نہ ہو سکی ، پہلی نظر میں جب میں نے انہیں دیکھا تو ان کے چہرے میں نورانیت جھلک رہی تھی ، شیشہ کی طرح شفاف ، انہیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے کہ انسان شیشے میں اپنا عکس دیکھ رہا ہو ۔ جب میں جاگ اٹھا تو دورۂ حدیث کی تدریس کے شوق نے عشق کی کیفیت اختیار کر لی تھی ۔ میں نے فیصلہ کیا کہ لیشاور جا کر ان روپوں سے صحاح ستہ کی کتابیں خریدوں ۔ لیکن پہلے حضرت مولانا قطب الدین

عوزعشتیؒ سے دورۂ حدیث پڑھانے کی اجازت لوں۔

مولانا قطب الدین عوزعشتیؒ سے اجازت حدیث | اجازت کے ارادے سے میں نے حضرت کی خدمت میں حاضری دی اس وقت مولانا طلباء کو مؤطا پڑھا رہے تھے۔ میں نے ان سے اجازت حدیث مانگی انہوں نے مجھے موطا امام مالکؒ کی دے دی اور پڑھنے کا حکم دیا۔ میں نے جب پہلا صفحہ پڑھا تو انہوں نے مسکرا کر کتاب بند کی اور فرمایا جاؤ میری طرف سے آپ جیسے آدمیوں کو صحاح ستہ پڑھانے کی اجازت ہے، کیونکہ یہ ہر انسان کے بس کی بات نہیں حضرت قطب الدینؒ اور میرے استاد الحدیث حضرت مولانا عبدالرحمٰنؒ دونوں ہم درس رہ چکے تھے اور دونوں حضراتؒ نے دورۂ حدیث حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے پڑھا تھا۔ حضرت مولانا قطب الدینؒ سے اجازت حاصل کرنے کے بعد میں نے باقاعدہ صحاح ستہ پڑھانا شروع کیا، کتابیں خریدیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اور علمی کتابیں بھی پڑھائیں۔ اور ایک مخلوط طریقہ سے میں تقریباً ۲۶ سال تک درس دیتا رہا۔ ایک رات میں نے خواب میں انتقال جناب سرور کائناتؐ دیکھا، ان کی چارپائی کے قریب ایک پستول پڑا تھا میں نے وہ اٹھا لیا اور سینے سے باندھ لیا۔ لیکن اس کی پٹی بہت لمبی تھی اور سینے سے نیچے تک لٹک رہی تھی۔ جب میں جاگا تو تعبیر پر متحیر ہوا۔ لیکن جلد ہی حقیقت معلوم ہوئی، کیونکہ دوسری رات جب میں نے خواب دیکھا کہ حضرت اخوند صاحب سوات مارتونگ میں تشریف لائے ہیں۔ وہ اس جگہ جہاں ایک مزار ہے، خیمہ زن تھے اور وہیں سے احکامات صادر فرما رہے تھے ایک شخص میرے پاس آیا اور ایک لفافہ مجھے دے کر واپس چلا گیا جب میں نے لفافہ کھولا تو اس میں لکھا تھا کہ: میری طرف سے تم حاکم ہو۔

دارالعلوم سیدو میں | چند روز کے بعد تقسیم ہند سے قبل بادشاہ صاحب اور والئ سوات صاحب نے یہ ارادہ کیا کہ سیدو شریف میں ایک دارالعلوم کھولیں۔ اس وقت کے ولی عہد صاحب نے مجھے بذریعہ ٹیلیفون اطلاع دی کہ وہ ایک دارالعلوم کھول رہے ہیں۔ اور میں بحیثیت صدر مدرس وہاں پہنچ جاؤں۔ اور ایک عالم بھی بطور قاصد کے بھیج دیا۔ چونکہ میں علیل تھا اس لئے میں نے معذرت کا اظہار کیا اور انہیں جواباً کہا کہ اگر زندگی رہی اور صحت ہوئی تو حاضر خدمت ہو جاؤں گا۔ دارالعلوم کا قیام و افتتاح ذیقعدہ ۱۹۴۵ء میں ہوا۔ اسی دوران مجھے بار بار دعوت دی گئی، لیکن چونکہ میں علیل تھا۔ اس لئے وہاں نہ پہنچ سکا۔ چند مہینوں کی علالت کے بعد جب صحت قدرے اچھی ہوئی تو میں ربیع الاول کے مہینہ میں سوات چلا گیا۔ اور ۱۰ ربیع الاول کو دارالعلوم میں درس شروع کیا۔ اس سال چونکہ تعلیمی سال میں چند ماہ رہ گئے تھے۔ اس لئے دورۂ حدیث کا انتظام نہ ہو سکا، اور آئندہ سال کے لئے یہ ارادہ پکا کر لیا۔ اور اسی طرح اگلے

سال دورہ حدیث کے علاوہ فنون وغیرہ کے درس بھی باقاعدہ شروع ہو گئے۔ ان دنوں مہمانوں اور متعلقین کے آنے جانے کی وجہ سے مجھے مالی دشواریوں کا بہت سامنا کرنا پڑا۔

میاں گل عبدالودود بادشاہ کیساتھ قیام | ایک دن بادشاہ صاحب نے مجھے طلب فرمایا اور کہا کہ چونکہ میرے مہمان زیادہ آتے رہتے ہیں اور ان کی خاطر تواضع وہاں کے شایان شان ناممکن ہے۔ اس لئے میں ان کے ساتھ ان کے ذاتی محل جسکا نام عقبہ تھا میں رہوں۔ چنانچہ میں وہاں منتقل ہوا اور میری دشواریاں اور پریشانیاں ختم ہو گئیں۔ کیونکہ چائے صبح کے وقت نوکر لے آتا اور کھانا بادشاہ صاحب کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھ کر کھاتا۔ نیز عقبہ سے دارالعلوم تک آنے جانے سے ورزش بھی ہو جاتی اس لئے بفضلِ خدا صحت بالکل ٹھیک ہوئی۔ بادشاہ صاحب کے ساتھ عقبہ میں تقریباً پندرہ سال میں نے گذارے۔ اسی دوران میں ہر جمعرات کو باجازت، بادشاہ صاحب مسجد ڈبہ منگورہ جاتا، وہاں میرے فرزند مولانا رشید احمد اور میرے چچا زاد بھائی مولانا امان اللہ مقیم تھے۔ پندرہ سال بعد دارالعلوم منگورہ کے قریب ایک نئی عمارت میں منتقل کی گئی۔ چونکہ اب روزانہ عقبہ سے اس نئی جگہ آنا دشوار تھا، اس لئے میں نے بادشاہ صاحب سے منگورہ میں قیام کی اجازت لی۔ مولانا رشید احمد اور مولانا امان اللہ فراغت کے بعد مارتونگ چلے گئے اور وہیں سے علم دین کے تشنگان کی پیاس بجھاتے رہے۔

طلبہ کی حالت میں فرق | میں نے بیس سال تک جن طلباء کو پڑھایا ان میں ہر وطن اور ہر قوم کے لوگ تھے۔ اور ان میں طلبِ دین کا جذبہ تھا، خلوص تھا، اور وہ نہایت شوق سے دینِ الٰہی سے معرفت کی خاطر اتنی صعوبتیں برداشت کر کے آتے تھے۔ لیکن آئندہ چھ سال تک میں نے جن طلباء کو پڑھایا، ان میں سے اکثر سند کے لئے آیا کرتے تھے، انہیں نہ دین سے غرض تھی اور نہ عمل و علم کا شوق۔ بعض مدرسی اور عہدوں کے لالچ میں مگن تھے۔

حالانکہ ہمارے دارالعلوم سے ایسے طلباء بھی فارغ ہوئے ہیں جنہیں سرکاری عہدوں کی پیشکش نہایت عزت و احترام کے ساتھ کی گئی تھی۔ اور وہ دارالعلوم اسلامیہ اور دارالعلوم چار باغ میں مدرسی کے اہم فرائض پر مامور کئے گئے تھے۔ میں نے کئی بار استعفیٰ دینے کی کوشش کی لیکن ہر بار بادشاہ صاحب نے مجھے اس ارادے سے باز رکھا، اور مجھے نہایت ادب سے تدریس کے لئے روکے رکھا۔ اور یہ کہتے کہ اگر تم والی صاحب کو استعفیٰ کی منظوری کے لئے مجبور بھی کر دو تو وہ صرف مجبوری ہوگی۔ اور جس وقت وہ آپ کا استعفیٰ خوشی سے منظور کریں تو وہ ناراض بھی نہ ہوں گے۔ اور آپ کو مراعات

سے بھی نوازدیں گے۔

مسجد تورہ قل پشاور میں تدریس | دارالعلوم سید و شریف کی تدریس سے کچھ عرصہ قبل کا واقعہ ہے کہ چونکہ میرے چچا نے شادی نہیں کی تھی، بالآخر ہم سب نے انہیں مجبور کیا کہ کوئی نشانی رہ جائے گی تو ہم نے ان کے لئے رشتہ کا انتخاب کیا اور مہر وغیرہ میں نے اپنے ذمہ لیا، جس کی وجہ سے مقروض ہونا پڑا۔ اس وقت میرے ساتھ بعض منتہی طلباء زیر تعلیم تھے جن میں ایک مولوی محمد سلیم بدخشانی تھے جو انتہائی درجہ کے ذکی اور ذہین تھے، فنون میزانی اور فنون حکمیہ ایک دفعہ پڑھ چکے تھے، لیکن دوبارہ مجھ سے حکمۃ و فلسفہ کی اونچی کتابیں پڑھنا چاہتے تھے وہ اس امر کے باعث ہوئے کہ میں دارالعلوم تورہ قل بائی پشاور میں مدرسی اختیار کروں تاکہ قرض بھی ادا ہو سکے اور ہماری پڑھائی میں بھی حرج نہ ہو، بلکہ پشاور میں تعلیمی افادہ اور بھی بڑھ جائے گا، تو میں نے یہ بات مان لی اور انہوں نے تورہ قل بائی کو منظوری کی اطلاع دی میں نے اپنے طالب العلموں کے ساتھ پشاور گیا اور تدریس شروع کی۔ دو تین ہی ماہ گذرے تھے کہ طلبہ کثرت سے اکٹھے ہوئے، ایک سو چالیس تک تعداد پہنچی اور کچھ طلبہ ہندوستان سے بھی آئے طلبہ کی بڑی بڑی جماعتیں ترتیب دیکر میں پڑھاتا۔ اور ۱۵ر شعبان کو گھر آیا، حاجی صاحب تورہ قل مرحوم نے کئی خطوط بھیجے کہ آپ پھر تشریف لائیں جتنی تنخواہ آپ لینا چاہیں، لیکن میری مجبوری قرض کی ادائیگی دور ہو چکی تھی۔ اس لئے وہاں جانے سے معذرت کی۔

تلامذہ | تلامذہ کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے، چند مشہور افراد جو معلوم ہو چکے ان کے نام یہ ہیں :-------

۱۔ استاذ الکل مولانا عبدالشکور معروف کندیا مولوی صاحب۔ ۲۔ مولانا عبدالغفار صاحب کوہستان۔ ۳۔ مرحوم مولوی کوہستانی۔ ۴۔ مولانا محمد ہاشم صاحب پنج شیر افغانستان۔ ۵۔ مولانا طالب محمد بدخشانی۔ ۶۔ مولانا محمد شریف کابلی۔ ۷۔ مولانا محمد سلیم بدخشانی۔ ۸۔ مولانا محمد شریف کاما مولوی صاحب۔ ۹۔ مولوی شمدڑہ صاحب۔ ۱۰۔ مولانا عبدالسلام چپرزوی۔ ۱۱۔ مولانا رحیم اللہ صاحب دارالعلوم سوات۔ ۱۲۔ مولانا زرولہ صاحب، دارالعلوم سوات۔ ۱۳۔ مولانا فضل مولیٰ صاحب مدرس دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک۔ ۱۴۔ مولانا عبدالرحمان صاحب شیخ الحدیث تعلیم القرآن راولپنڈی۔ ۱۵۔ مولانا عبدالمنان صاحب مینئی مدرس تعلیم القرآن راولپنڈی۔ ۱۶۔ مولانا نقیب احمد صاحب دیروی۔ ۱۷۔ مولانا عبدالحلیم کوہستانی سابق مدرس دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک۔ ۱۸۔ مولانا مغفور اللہ صاحب چپرزدی۔
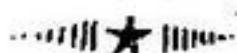
تبرکات و نوادر
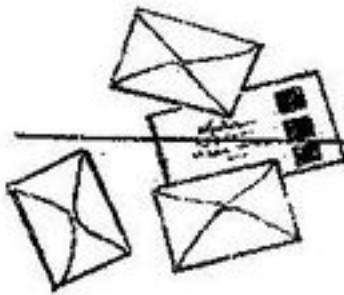
- مولانا خیر محمد صاحبؒ جالندھری
خلیفہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ

- مولانا محمد علیؒ جالندھری امیر تحفظ ختم نبوت

اکابر کے غیر مطبوعہ خطوط کی اشاعت کا سلسلہ بیچ میں رک گیا تھا، اب دوبارہ اس کا آغاز کیا جا رہا ہے۔ اکابر کے خطوط بذات خود تبرک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور نہ صرف یہ بلکہ ان حضرات کی علمی و فکری مساعی اور افکار پر بھی اس سے روشنی پڑتی ہے۔ (س ع)

حضرت مولانا خیر محمد صاحبؒ مہتمم مدرسہ خیر المدارس ملتان و خلیفہ حضرت حکیم الامت تھانویؒ

مخدومی المکرم حضرت مولانا صاحب زیدت مساعیکم و معالیکم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ! دعوت نامہ[1] سے سرفراز فرمایا گیا۔ یاد آوری کا بہت بہت شکریہ۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ میں مقرر و واعظ نہیں ہوں۔ احباب کے تقاضہ پر تکثیر سواد کے لئے استفادہ و زیارت کی غرض سے کہیں کہیں حاضر ہو جایا کرتا ہوں۔ اگر اس درجہ میں قبول ہو تو حاضری کی سعی کروں گا۔ انشاء اللہ تاریخ نوٹ کر لی ہے۔ امید ہے کہ مزاج گرامی بعافیت ہوگا۔ والسلام ۹ر جمادی الآخر ۱۳۷۲ھ

محترم المقام حضرت مولانا صاحب زید مجدھم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مکلف ہوں کہ ایک کاپی نصاب[3] کی ارسال کرتا ہوں۔ (جو ہنوز قابل اطمینان قلبی نہیں۔) اولین فرصت میں اس کی اصلاح فرما دی جاوے۔ یا مستقل نصاب مرتب فرما کر ممنون فرمایا جاوے۔ اس لئے کہ خیر المدارس اور اس جیسے دیگر مدارس عربیہ میں دور حاضر کے مناسب ایک جامع نصاب تعلیم عربی معہ ہدایات طریقہ تعلیم اور امتحانات کی جلد تجویز ہونے کی اشد ضرورت ہے جس میں

---

[1] المتوفی سنہ ۱۹۷۰ء [2] بسلسلہ شرکت جلسہ دستار بندی [3] وفاق المدارس کے مجوزہ نصاب میں ان امور کی کچھ رعایت رکھی گئی، تاہم اب بھی ان نکات کی اہمیت اور ضرورت اپنی جگہ برقرار ہے اور علمی حلقوں کو دعوت فکر دے رہی ہے۔

امور ذیل کی خاص رعایت رکھی گئی ہو:

۱- مدت تعلیم عربی آٹھ نو سال سے متجاوز نہ ہو۔ ۲- ابتدائی درجات میں خصوصاً باقی میں عموماً کتب ایسی تجویز ہوں، جو فن سے مناسبت پیدا کرنے اور استعداد بڑھانے اور اصلاح اخلاق میں خصوصی درجہ رکھتی ہوں۔ ۳- فن ادب میں ایسی ترتیب ملحوظ رکھی جائے کہ ابتدائی درجات میں عربی لکھنے بولنے کی باسانی رعایت ہو سکے۔ ۴- قدیم منطق، فلسفہ، کلام کی غیر ضروری کتب کو حذف کرکے اسکی جگہ کتب ضروریہ کو جگہ دی جاوے۔ ۵- ترجمہ قرآن مجید کی تعلیم کو ایسی طرح داخل درس کیا جاوے کہ اس کے مقاصد سے ایک گونہ مناسبت اور اسکی تبلیغ سے مہارت پیدا ہو جائے۔ ۶- دور حاضر کے مسائل پیش آمدہ معاشیات، نظام حکومت، سیاسیات وغیرہ کے متعلقہ کتب کو بھی داخل درس کیا جاوے۔ فقط ۵/۱۸ ۶۹ھ

مخدوم العلماء والفضلاء سیدی حضرت مولانا صاحب دامت فیوضکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ ملتمس ہوں۔ کہ مدرسہ ہذا کے امتحان سالانہ کیلئے ۳ سوالات سنن ابوداؤد شریف کے مرتب فرماکر جوابی لفافہ میں ارسال فرما دیئے جائیں۔ ممنون رہوں گا۔ امید ہے مزاج گرامی بعافیت ہوگا۔ دعا کا طالب ہوں۔ ۶/۷ ۷۸ھ

مخدوم العلماء والفضلاء مخدومی المکرم حضرت مولانا صاحب دام

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ: طلب خیریت کے بعد عارض ہوں۔ کہ مدرسہ خیر المدارس کا سالانہ جلسہ بتاریخ ۱۸، ۱۹، ۲۰ شعبان ۱۳۷۸ھ مطابق ۲۷، ۲۸ فروری یکم مارچ ۱۹۵۹ء جمعہ، ہفتہ، اتوار ہونا قرار پایا ہے۔ جناب کی خدمت عالیہ میں مؤدبانہ گذارش ہے۔ کہ تاریخ نوٹ فرماکر جلسہ میں تشریف آوری کا وعدہ فرمالیں۔ شکر گزار ہوں گا۔ امید ہے کہ مزاج گرامی بعافیت ہوگا۔ والسلام۔ ۶/۷۷ ۳ھ

مخدومنا المکرم حضرت مولانا صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ: مدارس عربیہ کی تنظیم کمیٹی کا مرتب کردہ دستور اساسی معہ فارم الحاق مدارس بھیجا گیا ہے۔ ملاحظہ فرماکر رائے گرامی سے مطلع فرمایا جائے۔ آئندہ ۱۶، ۱۷، ذی الحجہ ۷۸ھ مطابق ۲۴، ۲۵ جون ۱۹۵۹ء بدھ، جمعرات کو تنظیم کمیٹی کے اراکین کا دوسرا اجتماع ہونیوالا ہے، جس میں حضرت

لے وفاق المدارس العربیہ کے قیام کے ابتدائی دور کی خط وکتابت ہے۔ یہ رپورٹ اور مجوزہ اصلاحات بعد میں وفاق [illegible]

مولانا شمس الحق صاحب نصاب تعلیم کا مسودہ پیش فرما دیں گے۔ اگر کوئی مانع قوی نہ ہو، تو خصوصی دعوت قبول فرما کر تشریف لے آئیں، ممنون ہوں گا۔ اور تشریف آوری کی ٹرین سے مطلع فرما دیں۔ والسلام ۲ ذی الحجہ ۱۳۸۲ھ

محترم المقام مولانا عبدالحق صاحب زید مجدھم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ نصاب کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کرنے والے بعض حضرات سفر حجاز کیلئے روانہ ہو چکے ہیں۔ اس لئے ۱۳ ذی الحجہ ۱۳۸۲ھ کو منعقد ہونیوالے اجلاس نصاب کمیٹی کو بحکم صدر صاحب مدظلہ ملتوی کر دیا گیا ہے۔ تاریخ کے تعین سے جناب والا کو دوبارہ دفتر سے اطلاع دی جائے گی۔ والسلام ۔ ۸/۱۱/۸۲ھ

بگرامی خدمت جناب حضرت مولانا عبدالحق صاحب زید مجدہم عاملہ وفاق

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ ـــ جناب والا! مورخہ ۱۹، ۲۰ شوال ۱۳۸۳ھ مطابق ۴، ۵ مارچ ۱۹۶۴ء بروز بدھ، جمعرات، مدرسہ خیر المدارس ملتان میں مجلس عاملہ وفاق کا ایک نہایت ضروری اور اہم اجلاس منعقد ہو رہا ہے۔ تاکہ جملہ اراکین عاملہ اس پر غور فرمائیں کہ ملحقہ مدارس اب تک اپنی پرانی رفتار پہ چل رہے ہیں۔ اراکین عاملہ کا فرض ہے کہ اس کے اسباب و علل پر غور کریں۔ اور اسباب مدارس کی راہ میں اگر کچھ مشکلات ہیں۔ تو ان کا حل دریافت کریں۔ اور متفقہ طور پر ایسی کوشش کریں کہ شروع ہونے والے سال میں نمایاں اور موثر کامیابی حاصل ہو سکے۔ اس لئے آغاز سال میں ہی عاملہ کا یہ اجلاس طلب کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ جملہ اراکین مجلس عاملہ اپنے مشاغل دو چار دن چھوڑ کر اس اجلاس میں ضرور شرکت فرمائیں گے۔

ایجنڈا مندرجہ ذیل ہے۔

۱۔ گذشتہ اجلاس کی کاروائی کی توثیق۔ ۲۔ نصاب درجات تخصص اور اس سے متعلق قواعد و ضوابط کی منظوری۔ ۳۔ اصلاح مدارس عربیہ کے سلسلہ میں ایسی موثر تدابیر تجویز کرنا جن پر عمل کرنے سے شروع ہونے والے سال میں نمایاں کامیابی حاصل ہو سکے۔ ۴۔ دیگر امور بہ اجازت صدر۔ والسلام ۔ ۲۵ رمضان ۱۳۸۳ھ

منبع العلم و عمل مخدومی مکرمی حضرت مولانا صاحب،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ ـــ اجلاس عاملہ وفاق المدارس عربیہ ملتان۔ ۹ اکتوبر ۱۹۶۵ء بروز ہفتہ، بعد نماز ظہر ہونا قرار پایا ہے۔ اور متصل بعد میں دو دن مجلس شوریٰ کا اجلاس ہوگا۔ یہ اجلاس کئی وجوہ

سے اہم ہے۔ اس لئے آپ کی تشریف آوری ضروری کاموں سے بھی ضروری ہے۔ اس لیے ضرور تشریف لاکر ممنون فرما دیں۔ والسلام۔ ۷ر جمادی الآخر ۱۳۸۵ھ مطابق ۳ر اکتوبر ۱۹۶۵ء

حضرت مخدوم منا زادت فیوضکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ میں عرصہ پانچ ماہ سے درد کمر وغیرہ کی وجہ سے بیمار تھا۔ اس وجہ سے جواب میں تاخیر ہوتی۔ معاف فرمانا۔ اب بھی کچھ تکلیف ہے۔ والعذر عند کرام الناس مقبول۔

بگرامی خدمت محترم ومکرم حضرت مولانا عبدالحق صاحب زید مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاج اقدس۔ آپ کا گرامی نامہ مورخہ ۶ جمادی الثانی ۱۳۸۶ھ موصول ہوکر کاشفِ احوال ہوا۔ جواب ارسال بحضور ہے۔ کہ وفاق المدارس عربیہ کے سالانہ اجلاس شوریٰ کے التواء کی اطلاع کے ساتھ ہی دوبارہ انعقاد کی اطلاع بھی اسی عریضہ مطبوعہ کارڈ پہ تحریر کر دی گئی تھی۔ شاید وہ عریضہ بنظر خاطر ملاحظہ نہیں فرمایا گیا۔ اب یہ اجلاس عاملہ مورخہ ۳۰ رجب ۱۳۸۶ھ مطابق ۱۴ر نومبر ۱۹۶۶ء بروز پیر اور اجلاس شوریٰ مورخہ یکم شعبان ۱۳۸۶ھ مطابق ۱۵ر نومبر ۱۹۶۶ء بروز منگل مدرسہ خیر المدارس ملتان میں منعقد ہوگا۔ جدید تاریخیں نوٹ فرمائیں۔ جناب ناظم اعلیٰ صاحب چونکہ فی الحال قاہرہ تشریف لے جا چکے ہیں اس لئے ان کی غالباً غرۂ رجب تک واپسی پر سالانہ امتحان کے بارہ میں جناب والا کو اطلاع کر دی جائے گی۔ اور آپ کی ہر قسم کی دل سے دعا کرتا ہوں۔ والسلام۔ ۸ر اکتوبر ۱۹۶۶ء

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ کل مفتی محمود صاحب[1] یہاں تشریف لائے تھے۔ مختصر گفتگو کے بعد یہ قرار پایا۔ کہ چار ارکان ذیل (مولانا افغانی صاحب، مولانا بنوری صاحب، مولانا عبدالحق صاحب، مولانا نافع گل صاحب) کی موجودگی میں دونوں فریق[2] کے تین تین افراد یا کم وبیش ملتان میں جمع ہوں۔ اور ہر فریق اپنی بابت بالمشافہ سنائے۔ پھر چاروں ارکان جو متفقہ فیصلہ دیں۔ ہم دونوں فریق کو تسلیم کرنا ہوگا۔

---

[1] حضرت مولانا مفتی محمود صاحب۔ (س) [2] علماء کرام کے درمیان الیکشن سے قبل دو جمعیتوں کے قیام کی شکل میں جو خلفشار پیدا ہوا تھا۔ اس کی اصلاح اور باہمی صلح کے لئے کوششیں ہو رہی تھیں۔ (س)

اس لئے ماہ مئی کے کسی حصہ میں تاریخ مقرر کرکے دونوں فریق کو بلایا جائے گا۔ آنجناب اطلاع ثانی پر تشریف لانا منظور فرمادیں۔ ضرور منظور فرمادیں۔ ۲/۱۰ ۱۱ھ

حضرت العلامہ داعیٔ ختم نبوت مولانا محمد علی جالندھریؒ (ملتان)

مخدومی و مکرمی حضرت مولانا صاحب زاد مجدکم۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ــــ آپ کے ہاں ۱۶ مارچ کو پہنچوں گا، آپ اتنا ارشاد فرمادیں کہ میری تقریر دن کو بعد نماز ظہر ہوگی، یا بعد نماز عشاء۔ تاکہ میں حاضری کا پروگرام ایسا بنالوں کہ تقریر سے قبل پہنچ سکوں، امید ہے کہ جناب والا واپسی جواب ارسال فرماکر مشکور فرمادیں گے۔ یہ بھی عرض کردوں کہ مارچ میں فرصت بالکل نہیں۔ مشکل سے وقت نکالا ہے۔ آنے جانے میں دو یوم صرف ہوجائیں گے۔ اس لئے میں صرف اتنا وقت قیام کرسکوں گا۔ جتنا ضروری ہے۔ یعنی تقریر کا وقت، مزید قیام کی گنجائش نہ ہوگی، امید ہے۔ کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ اور دعا سے یاد فرمائیں گے۔ جواب جلد مرحمت فرمادیں والسلام۔

مخدومی و مکرمی حضرت مولانا صاحب زاد مجدکم

وعلیکم السلام! والا نامہ شرف الصدور آیا۔ آپ ۱۶، ۱۷ تاریخ مقرر فرمالیں۔ بندہ انشاء اللہ ۱۶ بروز شنبہ شریک ہوجائیگا۔ قبل ازیں حسب وعدہ عریضہ ارسال کرچکا ہوں۔ امید ہے کہ وہ بھی مل گیا ہوگا۔ ۲۲ فروری راولپنڈی حاضر ہوں گا۔ خط پہ پہنچنے کی اطلاع مرحمت فرمادیں کہ اطمینان ہو۔ جمیع احباب سے سلام مسنون۔ والسلام۔ ۱۲ جنوری۔

مخدوم محترم حضرت العلامہ زاد مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ والا نامہ شرف الصدور لایا۔ انشاء اللہ دن کو کسی گاڑی سے پہنچ جاؤں گا۔ اور بشرط امکان اطلاع قبل از وقت کردوں گا۔ تقریر سے قبل پہنچ جاؤں گا۔ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ امید ہے دعاؤں سے یاد فرمادیں گے۔ والسلام۔

ؔ سالانہ جلسہ دستاربندی میں عموماً شرکت فرماتے تھے۔

مخدومی و مکرمی حضرت مولانا صاحب دام ظلکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ۔ بڑی مشکل سے وقت نکال کر وعدہ کیا تھا۔ وہ بھی اس لئے کہ حاضری میرے لئے سعادت تھی۔ ۱۸ر فروری ایک تقریب میں دے چکا ہوں۔ ۲۰ر اگر تقریر کر کے روانہ ہی ہوں۔ تو بھی مقام موعود پہ پہنچ نہیں سکتا۔ شرمندہ ہوں۔ لیکن مجبور بھی ہوں۔ امید ہے کہ جناب معذرت قبول فرما دیں گے۔ والسلام ۔ ۲۴ر جنوری ۱۹۵۷ء

(چلتی گاڑی سے)

مخدومی مطاعی حضرت المکرم مولانا صاحب مدظلہ

وعلیکم السلام ۔ گرامی نامہ پہنچا ۔ تحریر پڑھ کر ندامت سے پانی ہو گیا ہوں۔ حسب الحکم انشاء اللہ ۱۷ر مارچ مغرب تک حاضر ہو جاؤں گا۔ اور شب کو تقریر کر کے ۱۱ بجے نوشہرہ سے خیبر میل لیکر واپس آ جاؤں گا۔ حضرت والا اس خادم کیلئے دعائے صحت و حق خاتمہ فرما دیں۔ یہ درخواست رسمی نہیں۔ آپ ایسے اکابر کی دعاؤں کا محتاج ہوں۔ احباب کرام سے سلام مسنون۔ ۵ر فروری ۱۹۵۷ء

محترم المقام حضرت مولانا صاحب زید مجدکم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ۔ انشاء اللہ ۱۷ر مارچ اتوار کے دن پنجاب ایکسپریس سے یا ایک بجے تقریباً پسنجر سے اکوڑہ اتروں گا۔ میرے مزاج کے مطابق صرف ایک طالب علم اسٹیشن پر بھیج دیں۔ اس سے زائد آدمی نہ آویں۔ والسلام ۔ ۱۱ر مارچ ۱۹۵۷ء

مخدومی مطاعی حضرت اقدس مدظلہ

وعلیکم السلام ! انشاء اللہ ۲۱ر اکتوبر صبح کسی گاڑی سے پہنچوں گا۔ بشرط .... دعا سے یاد فرما دیں۔ والسلام ۔ ۲۲ر اکتوبر ۱۹۵۸ء

حضرت مکرم زید مجدکم

سلام مسنون ! مزاج گرامی ۔ گذشتہ ہفتہ سے شدید عارضۂ قلب کا شکار ہوں۔ اب رو بصحت ہوں۔ مزید صحت و عافیت کے لئے محتاج دعا ہوں۔ میرے عزیز میاں، نور محمد ایم۔ اے جدید تعلیمیافتہ

اور علمی و مذہبی مذاق رکھنے والے ہیں۔ وہی محنت کا نتیجہ اسلام کے تصور عبادت کے عنوان پر رسالہ خدمت کر رہے ہیں۔ تصحیح فرما کر ان کی دلجوئی فرما دیں۔ اور ان کے حق میں دعا فرمائیں۔ اللہ پاک صحت و سلامتی کے ساتھ انہیں علم حق کے انعام سے نوازے۔ فقط والسلام ۔ ۱۷ر صفر ۱۳۹۱ھ [1]

عزیزم مولانا سمیع الحق صاحب زاد الطافکم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ لاہور ندوۃ المؤلفین کی تشکیل کے وقت آپ موجود تھے۔ جب اس انجمن کی منتظمہ کا نام پورا ہوا آپ کا نام نہ آیا۔ دوسرے روز صبح مولانا حامد میاں صاحب کے مدرسہ میں انجمن کا اجلاس ہوا، تو بعض دوستوں نے آپ کا نام پیش کیا۔ اور آپ کا نام اراکین میں شامل کر لیا گیا۔ اس کے بعد دو دفعہ میٹنگ ہوئی۔ آپ تشریف نہیں لائے۔ اب کام شروع کرنا اور اجلاس بلانا ہے۔ آپ سے دریافت کرنا ضروری ہے۔ کہ آپ اس ادارہ میں شرکت پسند نہیں فرماتے۔ یا آپ کی خدمت میں اطلاعی دعوتی خط نہیں پہنچا۔ مہربانی فرما کر واپسی ڈاک سے جواب سے مشکور فرما دیں۔ آپ کے خط آنے پر ہی آئندہ اجلاس کی تاریخ مقرر کی جائے گی۔ حضرت مولانا صاحب کی خدمت میں سلام عرض کریں۔ اپنے مدرسہ کے جملہ اساتذہ خصوصاً حضرت مولانا صاحب مدظلہ کی خیریت اور کوائف سے مطلع فرما دیں۔ والسلام

۱۲ر شوال ۱۳۸۶ھ

مکرم و محترم مولانا سمیع الحق صاحب

السلام علیکم۔ آپ کا خط ندوۃ المؤلفین کے سلسلہ میں ملا۔ میں خود محسوس کرتا ہوں کہ مدرسہ کے انتظامی امور کی ذمہ داری بتدریج آپ کے ہی کندھوں پر آتی جائیں گی۔ اور یہ بڑی خدمت اور ذمہ داری ہوگی۔ اس سے عہدہ برا ہونا بھی بڑی سعادت ہے۔ تاہم آدمیوں کی قلت متقاضی ہے کہ اور طرف بھی توجہ کی جائے ندوۃ المؤلفین میں کوئی ایسی ذمہ داری آپ پر ڈالی نہ جائے گی۔ جو دارالعلوم کے کاموں کو نقصان دہ ہو۔ سالانہ دو تین اجلاس کی شرکت، جس میں مشوروں سے امداد فرمائی جائے اور خرید حصص کیطرف توجہ کی جائے اس لئے دل چاہتا ہے۔ کہ اسکی منتظمہ میں آپ شریک ہوں۔ حضرت قبلہ مولانا صاحب دامت فیوضہم کی خدمت میں اتنی درخواست منظوری اجازت ہے۔ امید ہے کہ آپ اتنی خدمت قبول فرما کر مطلع فرمائیں گے۔ حضرت کی خدمت میں سلام مسنونہ اور بچوں کو دعا۔ ۱۵ر ذی القعدہ ۱۳۸۶ھ

---

[1] حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کے نام پر آخری مکتوب ہے جس دن صاحب مکتوب کا وصال ہوا اسی دن کی ڈاک سے یہ خط پہنچا شاید یہ زندگی کا آخری خط ہو۔ کتاب "اسلام کا نظام عبادات" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ صاحب مکتوب کے حسب ارشاد حضرت شیخ الحدیث مدظلہ نے کتاب پر نظر ثانی فرمائی۔

ابو شاھد۔ ایم۔ اے

مرزائی ترجمان
الفرقان
کے
مکتوب نگار کے نام

جناب بشیر احمد صاحب! آپ نے خط تو مدیر "الحق" کو لکھا مگر اسے دفتر "الفرقان" ربوہ، ارسال کر دیا جسے ربوہ کے مرزائی ترجمان نے ایڈیٹر الحق کے نام مکتوب مفتوح کی شکل میں شائع کر دیا۔ اس سے قبل بھی شیعہ نصاب کے بارہ میں مدیر الحق کے اداریہ کی الفرقان نے اہل تشیع کو بھڑکانے کی سعی کی کہ ایڈیٹر الحق اب آپ لوگوں کو بھی اقلیت قرار دینا چاہتے ہیں، حالانکہ مدیر الحق نہیں بلکہ اہل تشیع خود اپنے آپ کو علیحدگی کی جس راہ پر ڈھالنا چاہتے ہیں۔ ایڈیٹر الحق نے اس پر تنقید کی تھی، ہم نے مدیر الحق سے ربوہ کی اس چھیڑ خانی کا نوٹس لینے کی خواہش ظاہر کی مگر انہوں نے کہا کہ ہمیں اشخاص سے نہیں تحریک اور نظریات سے کام ہے، جس کا اپریشن الحق کر رہا ہے۔ مگر چونکہ مجھے بھی آپ کا "نصیحت نامہ" پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ آپ نے "الحق" کی معروضات غیر جانبدارانہ طور پر مطالعہ کرنے کی بجائے قادیانی انداز نظر سے دیکھی ہیں۔ امت مسلمہ کا اتحاد و یگانگت ہی وہ جذبہ ہے جو اہل حق کو مجبور کرتا ہے کہ ہر اس گندم نما جو فروش کو بے نقاب کیا جائے جو مسلمانان عالم کے اتحاد و یگانگت کو توڑ رہا ہے۔

تاریخ ہند کا غیر جانبدار قاری اس امر سے انکار نہیں کر سکتا۔ کہ مرزا صاحب وہ شخص ہیں جنہوں نے مسلمانان ہند میں افتراق کا بیج بویا اور ان کے متبعین نے اس خلیج افتراق کو وسیع تر کیا۔ آپ کو "الحق" کے تیز اور تند انداز تخاطب کا شکوہ ہے۔ بجا ہے ؎

چمن میں تلخ نوائی میری گوارا کر
کہ زہر بھی کرتا ہے کبھی کار تریاقی

تاہم اس بات کی آپ تصدیق کریں گے کہ الحق میں کسی کو "کتے" "سور" "حرامزادہ" اور مرزا صاحب کی پسندیدہ گالیوں سے یاد نہیں کیا گیا۔ مرزا صاحب کی تحریروں سے ان کی شستہ زبانی کے نمونے پیش کئے جا سکتے ہیں۔ اسی شخص نے اپنے مخالفین کو "ذریت البغایا" قرار دیا، کیا ان کی

یہ شگفتہ ذہنی اتحاد امت کے لئے تھی -؟

محترم! ذرا مرزا صاحب کی تحریریں پڑھئے اور فیصلہ کر لیجئے، کہ اس "فن شریف" میں مرزا صاحب کس قدر ید طولیٰ رکھتے ہیں۔

بشیر صاحب! آپ نے اس "ضلالت" کو سعادت سمجھ رکھا ہے کہ مرزا صاحب پر ایمان لے آئے - ذرا "سیرت المہدی" اور "ملفوظات" کا مطالعہ کیجئے - جو شخص ایک اچھا انسان نہیں، وہ آپ کا ہادی کیسے ہو سکتا ہے۔ انبیاء کا کردار اور سیرت ہمارے سامنے ہے اور مرزا صاحب کے لمحات زندگی بھی پوشیدہ نہیں۔ انبیائے کرام نے باطل نظام زندگی کو کبھی قبول نہیں کیا ہر لمحہ اسے بدلنے کی کوشش کرتے رہے، مگر ایک آپ کے مرزا صاحب ہیں، جنہوں نے انگریزی اقتدار کی مضبوطی اور استحکام کے لئے کتابوں کی پچاس الماریاں بھر دیں۔

مجھے افسوس ہے کہ آپ جیسے بیشمار افراد مرزا صاحب کی تحریروں کے قریب تک نہیں جاتے۔ اور پھر بھی انہیں اپنا "ہادی" بنا لیتے ہیں۔ مجھے مسرت ہے کہ مدیر الحق نے مرزائیت کا عمیق مطالعہ کیا ہے۔ اور وہ ان لوگوں کے ناپاک عزائم سے قوم کو آگاہ کرتے رہتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ انہیں توفیق مزید دے کہ وہ امت مسلمہ کو تباہ کرنے والوں کا جائزہ لیتے رہیں۔

اگر آپ غیر جانبداری اور منصف مزاجی سے کام لیں تو بہت کچھ عرض کیا جا سکتا ہے ــــ مگر سکہ بند قادیانی مبلغوں کے لئے یہی کہا جا سکتا ہے ــــ

کئے جاؤ میخوارو کام اپنا اپنا
سبو اپنا اپنا، جام اپنا اپنا

بقیہ: جمہوریت

ہے جس میں افراد اگر اتفاق سے دشمن ہو جاتے ہیں، تو انسان کی حیثیت سے نہیں شہری کی حیثیت سے نہیں، سپاہی کی حیثیت سے وطن کے باشندوں کی حیثیت سے نہیں وطن کے مدافع کی حیثیت سے الغرض ایک ریاست کے دشمن افراد نہیں دوسری ریاست ہی ہو سکتی ہے۔"　(معاہدہ عمرانی - صفحہ ۵۱)

(باقی آئندہ)

الازہر یونیورسٹی قاہرہ کے ریکٹر کی تشریف آوری

۵ر جنوری ۱۹۷۳ء کا دن دار العلوم حقانیہ کے لئے مسرتوں اور خوشیوں کا دن تھا جبکہ دار العلوم کو عالم اسلام کی مشہور یونیورسٹی جامع ازہر قاہرہ کے شیخ اکبر شیخ محمد فحام اور ان کے رفقاء کو خیر مقدم کہنے کا شرف حاصل ہوا۔ ۴ر جنوری کو یہ مژدہ پہنچا کہ شیخ ازہر کا پروگرام نہایت محدود ہے مگر انہوں نے دار العلوم حقانیہ کی دعوت قبول کرتے ہوئے نصف دن کے لئے صوبہ سرحد آنے کیلئے وقت نکال لیا ہے ـــــ تو دار العلوم کی فضاؤں میں مسرتوں کی لہر دوڑ گئی۔ شیخ الازہر کے ساتھ ادارہ بعوث و ثقافت اسلامیہ کے ڈائریکٹر شیخ عبد المنعم النمر سابق استاذ دار العلوم دیوبند اور مصر کے قابل فخر سفیر کبیر الاستاذ خشبہ بھی تھے، مہمانوں کا جہاز جب علی الصباح ۶ بجکر چالیس منٹ پر پشاور پہنچا تو جمعیۃ العلماء اسلام کے رہنما مولانا مفتی محمود صاحب وزیر اعلیٰ جناب امیر زادہ خان وزیر تعلیم سرحد اور دیگر افراد ان کے خیر مقدم کے لئے ہوائی اڈہ پر موجود تھے، ہوائی اڈہ سے حضرت مفتی صاحب کی رہنمائی میں معزز مہمان سیدھے دار العلوم حقانیہ روانہ ہوئے اور پونے آٹھ بجے شیخ ازہر موٹروں کے جلوس کے ساتھ دار العلوم حقانیہ میں داخل ہوئے۔ طلبہ اساتذہ اور حضرت شیخ الحدیث نے معزز مہمانوں کا نہایت گرمجوشی سے استقبال کیا دار العلوم سے باہر طلبہ نے "باب ناصر" کے نام سے ایک آرائشی دروازہ بنایا تھا۔ اور طلبہ کے "عاش شیخ الازہر"۔ "عاش جمال عبد الناصر"۔ "عاش مفتی محمود"ـــــ "عاش شیخ الحقانیہ" کے نعروں سے دار العلوم کے در و دیوار گونج اٹھے، معزز مہمان کچھ دیر دفتر اہتمام میں تشریف فرما رہے۔ یہاں انہوں نے اپنے دستخطوں سے مزین قرآن کریم مطبوعہ حکومت مصر کی ایک پیٹی حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کو پیش فرمائی، بعد میں حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کی طرف سے دار الحدیث میں ضیافت کی تقریب ہوئی جس میں دار العلوم کے تمام اساتذہ اور بعض اراکین نے بھی مہمانوں کے ساتھ شرکت کی، اس کے بعد شیخ الازہر نے دار العلوم کا تفصیلی معائنہ کیا اسباق کے

ادقات شروع تھے شیخ بعض درسگاہوں میں گئے جہاں اس وقت بیضاوی شریف، مختصر المعانی، ہدایۃ النحو اور مطول کے اسباق ہو رہے تھے، آپ نے معروف کتابوں ان کے مصنفین اور زیر بحث موضوع کے بارہ میں دلچسپی کا اظہار کیا اور یہاں کے دینی مدارس کے طریقۂ درس، نشست اور طلبہ و اساتذہ کی صورتوں سے اور دینی تصلب سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے معائنہ کے دوران آپ جب دارالعلوم سے ملحق شعبۂ اطفال مدرسہ تعلیم القرآن ماڈل سکول میں گئے تو بچوں نے خوشی میں ہوائی فائرنگ کی، پھولوں کے گلدستے پیش کئے، مخصوص سلامی دی اور نہایت نظم وضبط سے شیخ کا خیر مقدم کیا یہاں طلبہ نے تجوید و قرائت کا مظاہرہ کیا جس پر شیخ نے دلی دعاؤں کا اظہار کیا۔

اس کے بعد دارالحدیث ہال میں مہمانوں کے اکرام میں استقبالیہ جلسہ منعقد ہوا، نہ صرف ہال طلبہ سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، بلکہ نصف سے زیادہ سامعین نے باہر کھڑے ہو کر لاؤڈ سپیکر کے ذریعہ کارروائی سنی ـــ تلاوت کلام پاک، نہایت موثر انداز میں مولوی فضل الرحمان صاحب متعلم دارالعلوم حقانیہ (جو مفتی محمود صاحب وزیر اعلیٰ سرحد کے بڑے صاحبزادہ ہیں۔) نے فرمائی اس کے بعد حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہٗ مہتمم دارالعلوم الحقانیہ نے دارالعلوم کیطرف سے سپاسنامہ پیش کیا جسے مولانا سمیع الحق ایڈیٹر الحق نے پڑھ کر سنایا، سپاسنامہ میں جامع ازھر کی علمی خدمات، مصر اور حکومت مصر کی سیاسی اہمیت اور دارالعلوم حقانیہ کے ساتھ جامع ازھر کے علمی اور ثقافتی روابط کے قیام و ترقی اور عالم عرب کے ساتھ اسلامی بنیادوں پر رشتوں کی مزید استواری وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ اور اس شدید سردی اور مصروفیت کے باوجود دارالعلوم تشریف لانے پر مہمانوں کا شکریہ ادا کیا گیا بالخصوص جامع ازھر کا دارالعلوم حقانیہ کی سند کو بی۔اے کے مماثل قرار دینے پر شیخ ازھر کا شکریہ بھی ادا کیا گیا۔ سپاسنامہ کے بعد فقیہ اسلام مولانا مفتی محمود نے علماء ہند اور جمیعۃ العلماء اسلام کی دینی اور سیاسی تاریخ پر فی البدیہہ ایک نہایت جچی تلی تقریر فرمائی۔ آپ نے نہ صرف دینی مدارس کے پس منظر اور جنگ آزادی میں علماء کی قربانیوں پر روشنی ڈالی بلکہ عربی کی اہمیت کیساتھ عالم اسلام اور عربوں کے درمیان دینی اور اسلامی روابط کی ضرورت اور باہمی اتحاد کی ضرورت کو نہایت حکیمانہ انداز میں پیش کیا۔ نیز پاکستان میں علماء کے دستوری مساعی اور مجوزہ دستور کی اسلامی دفعات کا بھی جامع انداز میں ذکر کیا۔ شیخ الازھر نے آخر میں مختصر وقت میں اپنی تقریر میں تجوید و قرائت، عالم اسلام اور پاکستان کے لئے عربی بحیثیت زبان کی ضرورت پر روشنی ڈالی اس خطہ کی دینی و علمی حیثیت پر بڑی مسرتوں کا اظہار کیا اور دارالعلوم کیساتھ علمی اور ثقافتی جدید کتابوں وغیرہ کی شکل میں امداد کے لئے بھی وعدہ فرمایا۔ آخر میں حضرت شیخ الحدیث مدظلہٗ نے شیخ الازھر کو ایک ترکستانی چوغہ پہنایا اور اسی گرمجوشی کیساتھ دارالعلوم نے ان معزز مہمانوں کو الوداع کہا ـــــــ ▬ ▬

قدوم شيخ الازهر وخطابه بدار العلوم الحقانيه

صبيح يوم الخميس (۲۳-۱-۷۵) شرف الشيخ محمد محمد الفحّام شيخ الازهر ورفيقه الاستاذ عبد المنعم النمر مدير البحوث والثقافة الاسلامية بالقاهرة. دار العلوم الحقانيه باکوڑہ ختک في منطقة الحدود الشمالية الغربية باكستان - القى الشيخ الامام الاكبر بقاعة الحفلات (دار الحديث) في جلسة الترحيب خطاباً وقبل ذلك رحبه الشيخ المفتي محمود قائد جمعية علماء الاسلام ورئيس حكومة بشاور بكلام مؤثر ذكر فيه جهود علماء الهند في سبيل الدين وتحرير الوطن وغير ذلك من اهم الامور وفي بداءة الحفلة تقدم الشيخ مولانا عبد الحق مدير دار العلوم الحقانيه وشيخ الحديث بها كلمة الترحيب رحب الاضياف الكرام بترحيبات حارة وتهانى للازهر الشريف ولحكومة مصر العزيزة وبطل الاسلام جمال عبد الناصر مع الطيب التمنيات للعرب والمسلمين وخاصة للشعب المصري ونحن نقدم اولاً كلمات الشيخ الاكبر محمد الفحّام ويتبعه خطاب الشيخ صاحب الفضيلة مفتى محمود ثم كلمة الترحيب للشيخ عبد الحق شيخ الحقانيه وفي اختتام كلمات الاضياف الكرام من كتاب الاراء في حق دار العلوم الحقانيه ولما ورد الشيخ دار العلوم الحقانيه رحبه الطلبة والاساتذة بترحيب حار وعاين الشيخ مع رفقته الكرام المنهج العلمي والتدريسي وسائر شعب دار العلوم ثم طاف ببعض الفصول واستمع الى بعض الدروس وقد ابدى الشيخ المسرة بكل ذلك في خطابه الآتي ــــ (سميع الحق)

★

بسم الله الرحمن الرحيم وبه نستعين اظن انكم لستم بحاجة الى ان تستمعوا كلاماً بعد الكلام الذي القاه صاحب الفضيلة الاستاذ الكبير والمفتي العظيم محمود۔

ولكن لي كلمتان اثنتان: كلمة الاولى على القرآن - لفت نظري - وانا استمع الى القرآن ان هنا اناساً يقرءون القرآن والقرآن كما ينبغي ان يكون مجوداً حالة قراءة الانسان

وحدة فی خلوته فیجب ان یتعود الانسان ان یقرء مجودا فاذا ما قرء مجودا الیس القرآن لا فی الصلوۃ ولا فی غیر الصلوۃ -

وقد قال فضیلۃ المفتی ان اللغۃ العربیۃ هی اللغۃ التی ینبغی لکل مسلم ان یتعلمها وان یتکلم بها فنحن مسلمون ونحن اخوۃ کما قال تعالی انما المؤمنون اخوۃ (الآیۃ)

ولکن هذہ الاخوۃ وهذہ الوحدۃ لا تتاکد ولا تتمکن الا اذا کانت هناک وحدۃ فی اللغۃ العربیۃ ــ لیس معنی هذا ان نترک سائر اللغات لکل انسان لغۃ فاللغات واختلافها امر ضروری وامر ارادہ اللہ تعالی فیقول ــ ومن آیاتہ خلق السموات والارض واختلاف السنتکم ــ هذا من علاقۃ قدرۃ اللہ ولکن یجب علی کل واحد یتکلم البشتو ویتکلم الاردو ویتکلم الفارسیۃ ان یتعلم الی جانب ذلک العربیۃ ولیس لها تعصب لان لغۃ العربیۃ لیس لغۃ العرب فقط بل انما هی لغۃ الاسلام ولغۃ القرآن ولغۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم یجب ان ننظر لها من هذہ الناحیۃ وابو منصور الثعالبی قال فی مقدمۃ کتابہ فقہ اللغۃ ـ من احب اللہ تعالی احب رسولہ محمداً صلی اللہ علیہ وسلم ومن احب النبی العربی احب العرب ومن احب العرب احب العربی ومن احب العربی عنی بها وثابر علیها وصرف همتہ الیها۔ فاذا کنا نحب اللہ حقیقۃ ونحب الرسول ونحب العرب یجب ان نتعلم العربی لیس سهلاً علی مسلم ان یدخل بلداً اسلامیا فلا یسمع فیہ اللغۃ العربیہ وهذا عار علینا یجب علینا ان نتعلم العربیہ وان نبذل کل جهود ــ

وقد سررت الآن وانا اطوف علی بعض فصول دار العلوم الحقانیہ واری اهتماماً عظیماً من بعض الفصول فی تعلم اللغۃ العربیۃ ولکن اری انکم تتعلمون اللغۃ العربیۃ قدیمۃ جداً اظن یرجع تاریخ کتبها الی ماتین او ثلاث مائۃ سنۃ۔

والآن انما یجب ان یکون لکم کتب عصریۃ حدیثۃ سهلۃ وان شاء اللہ انا اجتهد ان نرسل لکم من الکتب العربیۃ الحدیثۃ ما یفیدکم فی اللغۃ العربیۃ ــ لان لغۃ العربیۃ هی اهم شیء عندنا وارجوا الحیاۃ حتی اری ان المسلمون یتکلمون اللغۃ الواحدۃ وهی اللغۃ العربیۃ وقد سرنی ما اعلنہ سیادۃ مفتی محمود من انہ طلب ان تکون اللغۃ العربیۃ هی اللغۃ الرسمیۃ لهذہ البلاد وهی لغۃ رسمیۃ

فی بلاد العرب سرّ فی هذا الخبر وارجوا ان یحقق اللّٰه لہ فی کلما یرجوه .

اللغة العربیة والقرآن اھم شیئ — وھنالک لبعض العلوم الحدیثة اللتی التصق بنافی الحیات ھذه فی الدرجة الثانیة من القرآن ومن اللغة العربیة .

بقی علینا ان نتوجّہ بالشکر الخالص للّٰه تعالیٰ اولاً الذی ھدانی لزیارتکم وھذه الزیارة لثالث مرة زرت باکستان اولاً فی سنتین وخمسین سنة ۱۹۵۲ء وزرتھا ثانیا فی سنة ۱۹۶۱ء زرت البلاد والقریٰ والاساکن والمدن والمواطن الذی زرتھا کثیرة ولکن ترک ھذه الزیارة فی نفسی اثراً وکنت مسروراً جداً بزیارة لبشاور سنة ۱۹۶۱ء والتقاء اھلھا الیٰ حد انی اشعت فی الناس کلھم — ان لم یدخل اھل بشاور الجنة فلن یدخلھا احد — لانی اعتقد انھم مسلمون حقیقةً متمسکون بدینھم اقویاء شجعان وھذه زیارة ثالثة وانی ارجوا اللّٰه تعالیٰ ان مدّ اللّٰه اجلی الی مرة رابعة ان اراکم متکلمین فی اللغة العربیة ولا اجد من یجھل العربیة — والباقی الآن ھی الشکر للّٰه والشکر للسید الفاضل المفتی العظیم والشکر للشیخ عبدالحق وارجوا لھما دوام التوفیق واشکرکم اجمعین علی استماعکم ھذه الکلمة وعلی حسن مقابلتکم وارجوا اللّٰه ان یوفقنا جمیعاً لما فیہ صلاحنا وصلاح امة محمد صلی اللّٰه علیہ وسلم والصلوٰة والسلام علی خیر البریة —

تاریخنا الدینی والسیاسی

لصاحب الفضیلة الفقیہ المفتی محمود رئیس الوزراء سرحد
کلام القاه الشیخ المفتی فی حفلة الترحیب
لشیخ الازھر حین قدومہ لدارالعلوم الحقانیہ

الحمد للّٰه الحمد للّٰه وکفی وسلامٌ علی عباده الذین اصطفی فیا ایھا الاضیاف الکرام لاسیما الامام الاکبر وشیخ الازھر الشریف والشیخ الدکتور عبدالمنعم النمر ایھا الاضیاف لتشرفنا بلقاءکم اسعدتمونا وشرفتمونا واللّٰه نحن مسرورون بلقاءکم وقدومکم جداً — ھذه المنطقة — المنطقة الشمالیة الغربیة ترحب بکم ایھا الشیوخ

وبعد ذلك اقول ان هذه المدرسة - دار العلوم الحقانية - هی شعبة لدار العلوم الديوبندية ان دار العلوم الديوبندية هی ام المدارس كلها فی باكستان والهند واقول عن ضرورة هذه المدارس العربية الدينية ان الانجليز لما تسلط على هذه البلاد وعلى هذه الديار جعل المدارس الدينية كلها مسدودة واغلق علينا العلوم والمعارف الاسلامية فلما اضطررنا الى التعليم الاسلامی الدينی واحتجنا الى المدارس بنينا هذه المدارس واول مدرسة بنی فی الهند دار العلوم فی ديوبند ان هذه المدارس كانت حرة لا تعلق للحكومة بها وكان كتب فی الخط الاساسی فی دار العلوم ان لا يقبل فيها شيئ من التبرعات من تبرعات الحكومة وكان ينفق على هذه المدارس من نفقات الشعب هكذا هؤلاء الاساتذة والمدرسون والعلماء كانوا يدرسون القرآن والحديث والفقه والعلوم العربية كلها مجاناً على هذا الطريق يجلسون فی المساجد والمكاتب وكان حولهم الطلاب ويدرسون فهكذا كانت حياتهم منذ مأتی سنة كانوا فی مشقة، كانوا فی مسكنة وتحملوا الشدائد الكثيرة فی سبيل هذا التعليم الدينی والتدريس فبعد ذلك لما ذهب الانكليز وتحرر الوطن۔

وانی اقول ان تحرير الوطن فيه حركات كثيرة للعلماء وكان استاذ العلماء شيخ الهند مولانا محمود الحسن الديوبندی اسيراً ومحبوساً فی جزيرة مالطا اربع سنين وكذلك تلامذته مولانا السيد حسين احمد المدنی والمفتی كفاية الله الدهلوی ومولانا عبيد الله السندهی والشيخ اشرف علی التهانوی والشيخ شبير احمد العثمانی والشيخ فخر الدين احمد وكذلك العلماء الكثير الذين كانوا اجبال العلم فی عصرهم كانوا خداماً للدين وكانوا خداماً للعلوم والمعارف وكانوا فی حركة وشكلوه فی السجون ولهم تضحيات كثيرة فی سبيل التحرير وبعد ذلك تقبل الله جهودهم - تحرر الوطن - ولكن انقسمت الهند ومنعت باكستان وكان باكستان لها جنبتان جنبة فی الشرق يقال لها الباكستان الشرقية وجنبة فی الغرب يقال لها الباكستان الغربية وبين الجنبتين كانت الهند كلها كان الهند فاصل بين جنبتی باكستان ولكن على الاسف لم تكون بين المسلمين مودة اسلامية واخوة دينية فالمرتبق هذه الاخيرة انفصل الباكستان الشرقية من باكستان الغربية - وانی اقول بعد قسمة الهند لما وجدنا المدارس كلها

في الهند وما كان هنا في باكستان الغربية مدرسة عربية دينية فلهذه الضرورة بنينا
هنا في باكستان الغربية مدارس كثيرة حرّة لاتتعلق بالحكومة بها ولهذه المدارس كلها
وفاق — وفاق المدارس العربية وتلحق قريباً من مأتي مدارس بهذا الوفاق وانا
الامين العام لهذا الوفاق — فانا اقول ايها الاضياف الكرام هذا هو تاريخ العملي
والآن نحن نحب ان نبدّل منهج التعليم شيئاً حتى يكون اهل هذه المدارس الذين
يتفرغون من هذه المدارس يمشون في سلك الطرق في طرق الحياة يمشون مع
الشعب بسوية يلزم عليهم ان يسلكوا مع الشباب المثقفين في سبيل الحياة كلها
ايها الاضياف الكرام اني قلت في خدمتكم بالامس في راولپنڈی ان جمعية علماء
الاسلام في باكستان هذا هو حزبنا الديني والسياسي هذا الحزب انما قرّر وطالب
من الحكومة ان يوضع في الدستور الدائم ان تكون اللغة العربية هي اللغة الرسمية
في باكستان وهذا يلزم علينا لامرين لامر داخلي وامر خارجي — امّا الامر الداخلي
فانّ باكستان فيها اقاليم كثيرة فيه اقليم الحدود الشمالية الغربية وفيه اقليم بنجاب
وفيه اقليم سنده وفيه اقليم بلوچستان ولكل من الاقاليم لغات مختلفة رأساً.

لغتنا پشتو الافغانية ولغة اهل پنجاب البنجابية ولغة اهل السنده السندهية
وكذلك اللغة البلوچية والكشميرية — لغات كثيرة مختلفة رأساً في باكستان
فليزم ان تكون لنا لغة جامعة تجمعنا وتجمع اهل باكستان.

ولا يمكن ان تكون لغة تقوم على هذا المقام الا اللغة العربية — الآن اللغة
الانجليزية هي جامعة بيننا ولكن طرق النجاة من اللغة الانكليزية ان ناخذ على اللغة
العربية وهذا ضرورتنا داخل البلاد يعني ينبغي لنا ان تكون لنا اللغة الجامعة هي العربي
واما الامر الثاني فاللغة العربية هي لغة الاسلام ولغة القرآن ولغة اخواننا العرب.
وهذه اللغة هي الوصلة الوحيدة للتعاون بين الدول الاسلامية كلها فيلزم علينا
ان ندرس اللغة العربية — ولكن لنا مشاكل ليس عندنا مدرسون يدرسون
اللغة العربية على النهج الجديد وليس عندنا كتب — فالرجاء منكم ايها الشيوخ ان
تعطونا المدرسين الاساتذة وان ترسلوا الينا الكتب الجديدة العربية فنجد
ذلك ان شاء الله نحن نستطيع ان نتكلم باللغة العربية السهلة الفصحى في خمس

سنين ان شاء الله تعالى — واني اقول بالاخير ان دين الاسلام ديننا ودين
المسلمين جميعاً في جميع العالم الاسلامي هذا هو دين العرب وهذا هو دين العجم
لا فرق بيننا وبينكم كما قال الله تعالى — انما المؤمنون اخوة وكما قال النبي صلى الله
عليه وسلم مثل المؤمنين في توادهم وتراحمهم وتعاطفهم كمثل جسد واحد اذا اشتكى
عينه اشتكى كله واذا اشتكى رأسه اشتكى كله (الحديث)

فنحن نحب ان تكون العلاقات بين الدول الاسلامية قوية مستحكمة و
هذا لا يمكن الا ان تكون البيئة في جميع الدول الاسلامية البيئة الاسلامية الدينية
ونحن قررنا في لجنة الدستورية قررنا في الدستور الدائم الذي يبحث في البرلمان
وان شاء الله نحن نفوز على ان نفتح الدستور الدائم وفق ما شرع الله تعالى ويكون
مأخذ القانون كتاب الله وسنة رسول الله ۔

وانا قررنا اولاً في هذا الدستور ان يكون دين الدولة هو الاسلام — وقررنا
في هذا الدستور ان لا يوضع قانون من القوانين الا وفقاً لكتاب الله وسنة رسول
الله صلى الله عليه وسلم ووضعنا في هذا الدستور ان تبدل جميع القوانين الغير الاسلاميه
اللتي كانت رائجة في زمن الانكليز ان نبدل كلها الى الاسلام وقررنا في الدستور
الدائم ان يكون رئيس الدولة هو المسلم ويكون رئيس الوزراء هو المسلم ووضعنا
في الدستور في حلف الرئيس وفي حلف رئيس الوزراء ان يكون في حلفه انا مسلم
وانا المعتقد بان الله واحد وانا المعتقد ان الوحي الذي انزل على محمد صلى الله عليه
وسلم آخر الوحي ويقول في حلفه انا اؤمن بالله واليوم الآخر ويوم الدين ويقول بان جميع
ضروريات الدين والتعليمات — تعاليم الاسلام كلها حق — فالغرض اذا كانت
الدول الاسلامية كلها متمسكين بحبل الله المتين كانت العلائق بيننا مستحكمة واخيراً
اذكر باللزوم ان اليهود يهود اسرائيل والهنود المشركون في الهند هم اعداؤنا واعداء
اخواننا العرب واعداء المسلمين كلهم نحن وانتم لا يمكن لنا ان نحل هذه المشاكل
الا بالتعاون بيننا وبينكم وانا اقول بالصراحة اننا معكم في مقابلة اليهود وان شاء الله
نحن فائزون وهم خاسرون وخائبون خذلهم الله في الدارين ۔

نحن معكم اجسادنا مع اجسادكم وارواحنا مع ارواحكم ودماءنا تقرأ ق

مع دماء كم وانتم معنا لاتحل مشكلتنا الابتعاونكم ولا تحل مشكلتكم الابتعاوننا وتعاون والهنود فاقول ان اليهود والهنود مثلنا كلتان وزناً ومعناً وقال الله تعالى — لتجدن اشد الناس عداوة للذين آمنوا اليهود والذين اشركوا — الهنود المشركون في الهند واليهود في اسرائيل - واخيراً نرحب بكم واقول لكم اهلاً وسهلاً والله انى اقول من عمق القلب انكم من اهل باكستان انتم كانكم باكستانيون اقول لكم مرحبا وارحبكم بتراحيب كثيرة حارة واشكركم على قدومكم الميمون وقلت بالامس ان الازهر الشريف يخدم العلم منذ الف سنة ان الازهر له منة عظيمة على جميع المسلمين خصوصاً على مسلمي باكستان ان الطلبة من باكستان يتعلمون في الازهر الشريف واقول الدكتور الشيخ عبد المنعم النمر كان مدرساً في ديوبند في دار العلوم والشيخ عبد الحق عميد هذه الجامعة كان مدرساً في دار العلوم الديوبندية فلهذه المناسبة اشكر الشيخ عبد المنعم النمر بالخصوص - والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته -

---

من كلمات شيخ الازهر ومدير البحوث والثقافة بالقاهرة
الاضياف الكرام يبدون المسرة بزيارتهم دار العلوم الحقانية

في صباح الخميس ٥/١/١٩٧٣م زرنا المدرسة الحقانية مع فضيلة المفتي محمود رئيس حكومة لبشاور وسررنا كثيراً ماتقوم به المدرسة من خدمات هامة للاسلام واللغة العربية ونرجو لها دوام التوفيق -

شيخ الازهر
محمد الفحام
٢٨/ ذي قعدة ١٣٩٢ھ

دكتور عبد المنعم النمر
مدير البحوث والثقافة الاسلامية
بالقاهرة

☆

نبذة من احوال دار العلوم الحقانية

بعد توزيع القارة الهندية بين الهند والباكستان وسدّ ابواب المدارس الدينية على الباكستانيين اسس الشيخ عبد الحق المحدث (الاستاد سابقا بدار العلوم الديوبندية عضو البرلمان المركزي بباكستان) دار العلوم الحقانية سنة ١٩٤٧ء لنشر العلوم والمعارف الاسلامية واعداد رجال الدعوة والتبليغ. وعدد خريجيها بفضل الله وعونه الى هذا الوقت بلغ الى الفين. كلّهم يؤدون الفرائض العلمية والدينية في مختلف شؤون الحياة. في اقطار باكستان وافغانستان وايران والثغور المتاخمة بالصين وروسيا.

عدد المراحل الدراسية فيها ثلث - ابتدائية ووسطانية ونهائية اعترفت المنطقة الشمالية الغربية بشهادتها ولذلك دولة باكستان تقبل خريجها لعهدة الامور الدينية في الجيوش وكذا دولة افغانستان تعترف بشهاداتها. والجامعة الازهر الشريف قبلت شهادتها بمستوى الشهادة العالمية وكل المدارس ورجال العلم والدين يعترفون بمكانة دار العلوم. عدد الطلاب حاليا يتجاوز من الف طالب سائر مصارف الطلبة طعاما ومسكنا وكتبا يتكفلها دار العلوم مجانا و ينفق على الطلبة والاساتذة يبلغ الى ثلاثمائة الف روبية قريبا التي تتكمل من تبرعات المسلمين لكونها اهلية لاحكومية ولدار العلوم شعب عديدة. شعبة الافتاء تجيب على الآف من المسائل كل سنة. وشعبة التجويد والقراءة. وشعبة التصنيف والتاليف فضلا عن مجلة شهرية "الحق" التي تنشر افكار الاسلام وتدافع عن حمى الاسلام ومن اهم اهدافها اتحاد العالم الاسلامي وايقاظ المسلمين ومبارزة الفكر الغربي المادي وشجع كثير من رجال الدين وزعماء المسلمين من العرب وغيرهم اهدافه دار العلوم واعترفوا بمكانتها العلمية عند قدومهم كالشيخ العلامة البشير الابراهيمي الجزائري المرحوم. والعلامة احمد بودة من الجزائر والشيخ عبد الفتاح ابو غدة من سوريا ومحمد محمد الفحام شيخ الازهر والشيخ عبد المنعم النمر بالازهر والشيخ عبد الغفور المدني بالمدينة المنورة وغيرهم من علماء كويت ومراكش وايران والاردن الى دار العلوم الحقانية حفظها الله وحماها للاسلام.

سميع الحق
(مدير مجلة الحق الشهرية)

★